بتقریب عید میلاد النبی

هر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

جلد نمبر ۸
شمارہ نمبر ۳۹

کراچی:- ہفتہ
۲۹ اکتوبر
۱۹۵۵ء

قیمت چھ آنے
سالانہ پندرہ روپے

As. -/6/-

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفت روزہ

طلوعِ اسلام

جلد ۸	ہفتہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۵ء	نمبر ۳۹

بصیرت افروز Page 3

سلیم کے نام Page 6

علم نبوی Page 10

سیرتِ مصطفٰے اور روایات Page 12

حضرت رسالتمآب صلعم کی تعلیم اور سیرت کا عملی پہلو Page 17

فردوس گم گشتہ

جناب پرویز کے ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا ھے۔ مفہوم کے علاوہ اگر خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھئے تو اردو زبان کی بہت کم کتابیں اس پایہ کی دکھائی دینگی۔

بڑا سائز۔ ضخامت قریب چار سو صفحات کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید جلد مضبوط۔ گرد پوش حسین۔
قیمت چھ روپے۔ علاوہ محصولڈاک۔

سلیم کے نام خطوط

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ھے جو مشرق و مغرب کے تصادم کے بعد ملوکیت کے وضع کردہ غلط مذھبی تصورات سے متنفر ہوتے ہوتے اسلام اور اسکے سرچشمۂ حیات قرآن ہی سے ھاتھ دھو چلا تھا۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کیگئی ھے کہ محسوس ھی نہیں ہوتا کہ ھم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ھیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کرکے رکھ دئے گئے ھیں جنھیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جاسکا تھا۔ یہ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کر چکے ھیں۔ قرآن کی روشنی اور محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز قلم۔ بڑا سائز ضخامت سوا چار سو صفحات۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید گرد پوش مصور مشرق جناب چغتائی کے قلم کا حسین مرقعہ۔ قیمت چھ روپے علاوہ محصولڈاک۔

اسلامی نظام

اسلامی مملکت کا بنیادی اصول کیا ھے اور اسلامی نظام کیسے قائم ہوسکتا ھے؟ اسکے جواب میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنھوں نے فکر و نظر کی نئی راھیں کھولدی ھیں۔ قیمت دو روپے۔

اسباب زوال امت

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ھے کہ ھمارا مرض کیا ھے اور علاج کیا۔

ضخامت ۱۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

قرآنی دستور

اس میں پاکستان کیلئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ھے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ھے۔

ضخامت دو سو چوبیس صفحات
قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلامی معاشرت

مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ، رھنے سہنے کا ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینے میں

ضخامت ۱۹۲ صفحات قیمت دو روپے۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوعِ اسلام

جلد ۸	ہفتہ	۲۹ اکتوبر ۱۹۵۵ء	نمبر ۳۹

صبحِ بہار

اے ظہور تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

جب زمین گرمی کی شدت سے تمتما اٹھتی ہے۔ تمازتِ آفتاب اس کی رگ رگ سے نمِ زندگی چوس لیتی ہے۔ آسمان کی شعلہ ریزیاں ساری فضا کو دہکتا ہوا انگارہ بنا دیتی ہیں۔ بادِ سموم کی ہلاکت سامانیاں تازگی و شگفتگی کی ہر نمود کو جھلس ڈالتی ہیں۔ پھول مرجھا جاتے ہیں شگوفوں کی گردن کے منکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لالہ کا رنگ اڑ جاتا ہے پتیاں سوکھ جاتی ہیں۔ شاخیں پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ سرو و صنوبر آتش دانِ ارضی کے دود کش .... دکھائی دیتے ہیں۔ تابندہ چشمے دیدۂ کور کی طرح بے نور ہو جاتے ہیں رم ریز ندیاں خطِ تقدیرِ محکوماں کی طرح بے آب رہ جاتی ہیں۔ زکی دہشت سے سائے کانپتے ہیں۔ راستے ہانپتے ہیں خنکی غاروں میں منہ چھپا لیتی ہے۔ ٹھنڈک سہم کر کنوؤں میں جا دبکتی ہے۔ وفورِ تپش سے سینۂ کائنات میں سانس رکنے لگتی ہے۔ جنگل کے جانور آسمانی شعلوں کی لپٹ سے کہیں پناہ نہیں پاتے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں نرم و نازک زبانیں نکالے نڈھال ہو کر گر جاتے ہیں۔ طائرِ نگاہ تک بھی کاشانۂ چشم میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ انسان زندگی اور اس کی تمام لطافتوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ سوختہ بخت انسان کھیت کے کنارے کھڑا التجائی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے کہ کہیں سے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان دکھائی دے، لیکن اس کی خاسرہ و نامراد نگاہیں، حسرت بن کر اس کے ویرانۂ قلب میں لوٹ آتی ہیں۔ اس طرح جب حیاتِ ارضی

کسی گوشے میں بھی امید کی نمی باقی نہیں رہتی، اور بساطِ کائنات کے کسی کونے میں بھی زندگی کی کوئی تازگی دکھائی نہیں دیتی تو یاس و نا امیدی کے انتہائی عالم میں، مبداءِ فیض کی کرم گستری سے سحابِ رحمت کسان کی آنکھوں کا نور بن کر فضائے آسمانی پر چھا جاتا ہے اور اپنی جواہر پاشیوں اور گہر ریزیوں سے دامنِ ارض کو بھر پور کر دیتا ہے۔ زمینِ مردہ میں پھر سے زندگی آ جاتی ہے۔ رگِ کائنات میں نبضِ حیات پھر سے متموج ہو جاتی ہے۔ زمانے کے سینے میں رکی ہوئی سانس پھر سے زندگی کی جوئے رواں بن جاتی ہے۔ چشموں کی خشک آنکھیں شرابِ زندگی کے چھلکتے ہوئے ساغر نور بن جاتی ہیں۔ ندیوں کی بے آب لکیریں بادۂ جاں فزا کی مسیحا نفسی سے رگِ جاں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سہمی ہوئی خنکیاں غاروں سے نکل کر فضاؤں پر چھا جاتی ہیں۔ دبکی ہوئی برودتیں کنوؤں کی تہوں سے اچھل کر بساطِ ارض پر پھیل جاتی ہیں۔ خشک پتیوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں میں از سرِ نو تازگی و شگفتگی آ جاتی ہے۔ شگوفے چٹکتے ہیں۔ کلیاں ہنستی ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے لطیف و لطیف جھونکے سرسبز و شاداب درختوں کی شاخوں میں لچک اور پھولوں میں یوں جنبش پیدا کر دیتے ہیں گویا ـــــ

بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

ہر طرف ایک نئی زندگی، اور ہر سمت ایک حیاتِ تازہ، جھومتی مسکراتی مچلتی، لوٹتی، ایک ایسی جنت نگاہ بن جاتی ہے جس کی ہر روش میں سوتوں کے چشمے ابلتے اور ہر تختے میں قہقہوں کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِن بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنشُرُ رَحْمَتَهُ (۴۲/۲۸)

اور یہ اللہ ہی کی ذات ہے جو ایسی نا امیدیوں کے بعد اپنے سحابِ کرم کو بھیجتی اور اس طرح اپنی بساطِ رحمت کو صفحۂ ارض پر بچھا دیتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ (۷/۵۷)

وہی کی ذات ہے جو زمین کے جھلس جانے کے بعد، ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اس کے ابرِ کرم کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نو کی بشارت دیتی ہیں۔ پھر وہ پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لاتی ہیں جس سے ہم اجڑی ہوئی بستیوں کو سیراب کرتے ہیں اور زمینِ مردہ سے طرح طرح کے پھل اگاتے ہیں۔

فَانظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۰/۵۰)

پس اگر تم آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہو تو اللہ کے ان آثارِ رحمت کو دیکھو اور غور کرو کہ وہ زمین کو اس کی موت کے بعد کس طرح حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

یہ فطرت کا نظام ہے۔ یہ اس کا قانون ہے جس کے

انتخابِ ماہِ نو

صبحِ بہار

آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

بحضورِ رسالت مآب (صلعم)

سلیم کے نام

علمِ نبوی

سیرتِ مصطفیٰ اور یہ روایات

حضرت رسالتمآب کی تعلیم

قوانین اٹل اور جس کے آئین غیر متبدل ہیں۔ یہ اس کا قاعدہ ہے جس کے قواعد و ضوابط میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی، کہ تبدیلیاں زمان و مکان کے اثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں، اور اس کی ذات زمان و مکان کی قیود سے ماورا اور ان کے اثرات سے بے نیاز ہے۔

لیکن ان مادی تشبیہات و استعارات سے ہٹ کر ذرا دنیائے انسانیت کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ وہاں بھی یہی اصولِ فطرت کس طرح کارفرما اور یہی آئینِ مشیت کس طرح عمل پیرا ہے۔ یہ مادی تشبیہات و استعارات بھی درحقیقت اسی مقصد کے لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ انسان ان محسوسات کی راہوں سے ان مجرد حقیقتوں کی طرف آئے اور جو کچھ عالمِ آفاق میں ہو رہا ہے اس سے عالمِ انفس پر دلیل لائے۔ تاریخ کے اوراق سے پوچھئے کہ اس کی ایک ایک یادداشت اس کی شہادت دے گی کہ اس وقت عالمِ انسانیت کی خشک سالی اس سے کہیں زیادہ شدید و مہیب تھی جس کا تشبیہی ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس وقت شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے بھی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول، وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے جس عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔

لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا چاروں طرف سے مایوس و ناامید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ متیٰ نصر اللہ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا جاتا۔ چنانچہ اس کے لئے اس رب ذوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں لئے۔ ربیع الاول کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا۔ اور بلد امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا جس سے انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے حیاتِ تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم سرّتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بخت بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذروں کو اس ذاتِ اطہر و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی۔ جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی۔ جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، فکر و نظر، دنیا و دین، توسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں، جو دانشِ نورانی و حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے، جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ اس مقدس ساعت پر آسمان نے خوش بختِ زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جھک جھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا۔ تو امیں فرشتے نے جنت سے نکالے ہوئے ابنِ آدم کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس و تمجید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیائے طاغوتی قوتوں کے تختِ الٹ دینے والا آگیا۔ جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی چونکہ اب انسانی تصورات کی دنیا نار کی جگہ نور سے معمور ہو گئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ اب مسلکِ ابراہیمی کی تکمیل کا دور آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آگیا۔ دنیائے باطل کی تاریکیاں دور ہو گئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے "جگمگاتا چراغ" کہہ کر پکارا إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۔ وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی۔ احبار و رہبان کی برہمنیت کے اطواق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کش نسلی و جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے۔ اور پابندِ قفس طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں اڑان بال کشائی عطا ہوا، اور انسان ایک مرتبہ پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی بفقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ (۳۰/۵۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

(پرویز)　　　(معراجِ انسانیت)

بہارِ صبحِ وجود صلی اللہ علیہ وسلم

وُہ رازِ خلقتِ ہستی، وُہ معنیٔ کونین
وُہ جانِ حسنِ ازل وُہ بہارِ صبحِ وجود
وُہ آفتابِ حرم نازنینِ کُنجِ حرا
وُہ دل کا نور وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دو جہاں وُہ محمدؐ عربی
بروحِ اعظم و پاکش درود لا محدود

آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ

از دمِ سیراب آں اُمّی لقب — لالہ رُست از ریگِ صحرائے عرب

او دلے در پیکرِ آدم نہاد — او نقاب از طلعتِ آدم کشاد

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد — مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

ہر خداوندِ کہن را او شکست — ہر کہن شاخ از نمِ او غنچہ بست

عقل را او صاحبِ اسرار کرد — عشق را او تیغِ جوہر دار کرد

از کلیدِ دین درِ دنیا کشاد — ہمچو او بطنِ اُمِّ گیتی نزاد

دینِ او آئینِ او تفسیرِ کُل

در جبینِ اُو خطِ تقدیرِ کُل

بحضورِ رسالتمآب

(غالب)

اے آنکہ چشم در رہت از موجِ گہر غبار — فردوس را بدامِ نگہ می کند شکار

تقدیر از وجودِ تو شیرازہ بستہ است — مجموعۂ مکارمِ اخلاقِ کردگار

توفیق در زمانِ تو ترتیب دادہ است — فرہنگِ آفرینش بشرحِ رموزِ کار

ہم گوہرِ ترا بفروغ خود آبرو — ہم صانعِ ترا بوجودِ تو افتخار

در بینِ کردہ اند بیارِ تو ایمنی — در بذل دادہ اند یمینِ ترا یسار

جنّت بکارگاہِ ولائے تو خلد بافت — رضوان بہ بارگاہِ رضائے تو پیشکار

بے رخصتِ ولائے تو طاعات مدعی — بے مزد ہم چو کوششِ دہقان بشورہ زار

بے عشرتِ رضائے تو اوقاتِ زندگی — تنگ و تبہ چو دیدۂ مورو دہانِ مار

می خواستم کہ شاہدِ مدحِ ترا کنم — دامان و جیب پُر ز گہرہائے شاہوار

در پیچ و تابِ عرضِ جنونِ شمارِ شوق — ابیاتِ راز صد برسانم بصد ہزار

ہر لفظ ر لطافتِ نیہ آرم ہزار حیا — ہر پردہ را بنولہ سنجم ہزار بار

تا کسوتِ وجودِ شب و روز را بدھر — از تابِ مہر و پرتوِ ماہ است پود و تار

تا سینہ راست نالہ در اندازِ کاو کاو — تا دیدہ راست جوشِ نگہ سازِ خار خار

تا سجدہ راست در رہِ حق مژدۂ قبول — تا عذر راست بر درِ بخشش نوید بار

تا شاخ راز جنبش بود غنچہ خندہ ریز — تا ابر راز شوق بود دیدہ اشکبار

بادا محیطِ نورز فیضِ تو موجزن — بادا بنائے دہر ز شرعِ تو استوار

عزمِ مجاہدانِ تو با چرخ ہمعنان — سعیِ موافقانِ تو با خلد ہم کنار

آنرا کہ بردہ اُلفتِ گیسوئے تو زخاک — سنبل دمد ز جیب سوادِ شبِ مزار

واں راکہ بر خلافِ تو رفتہ است در لحد — دودی بر آورند ولیکن ہم از دمار

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ — جامِ صہبائے محبت باز دہ

باز در عالم بیار ایامِ صلح — جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

شورشِ اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

باز ایں اوراق را شیرازہ کن — باز آئینِ محبت تازہ کن

رہروان را منزلِ تسلیم بخش — قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر

از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

سلیم کے نام

(عید میلاد النبیؐ)

پرویز

سلیم بیٹا! اللہ تمہیں خوش رکھے اور تمہارے ذوقِ قرآنی میں برکت عطا فرمائے رفتہ رفتہ تمہاری نگاہ کس قدر صاف اور تمہاری بصیرت کس قدر نورانی ہوتی جاتی ہے۔ قرآن کو غور و فکر سے سمجھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ وہ خود نور (روشنی) ہے اور انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے تمہیں ایک مرتبہ پہلے بھی لکھا تھا (اور یہ غالباً شروع ۱۹۵۳ء[1] کا ذکر ہے) میرے نزدیک دنیا کے لئے جشنِ مسرت کی تقریبات دو ہی ہیں۔ ایک نزولِ قرآن کی عید اور دوسری عید میلاد النبیؐ اور یہ دونوں تقریبات بھی ایک ہی سکے کے دو رخ اور ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں، اس لئے کہ نہ رسول اللہؐ کو قرآن سے الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی قرآن کو رسول اللہ سے الگ۔ قرآن، قلبِ محمدیؐ پر نازل شدہ وحیِ خداوندی کا نام ہے اور رسول اللہ قرآنی سیرت کے درخشندہ پیکر۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صرف احکام و قوانین ہی عطا نہیں کئے۔ بلکہ سیرتِ محمدیہ کے اصولی گوشوں کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔

تم نے پوچھا یہ ہے کہ رسالتِ محمدیہ کا مقصود کیا ہے؟ اس نے نوعِ انسانی کو کیا دیا ہے؟ اس کا وہ کونسا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے حضورؐ کا اسمِ گرامی محسنینِ عالمِ انسانیت کی فہرست میں سرِ عنوان چمکتا دکھائی دیتا ہے؟ اس سوال کے تفصیلی جواب میں تو ضخیم مجلدات لکھی جا سکتی ہیں (اور خود میری کتاب "معراجِ انسانیت" بھی اسی سوال کے جواب کی کوشش نا تمام ہے) لیکن قرآن نے ان تمام تفاصیل کو جس حسن و خوبی سے ایک فقرہ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو اس پر والہانہ وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سورۂ اعراف میں بعثتِ محمدی کی غایت و مقصود کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے کہ

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱۵۷)

وہ نوعِ انسانی کے سر سے تمام بوجھ اتار کر رکھ دے گا جس کے نیچے وہ دبی ہوئی چلی آ رہی ہے اور ان تمام زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں وہ جکڑی ہوئی ہے۔ یہ ہے سلیم! بعثتِ محمدیہؐ کی وہ عظیم غایت جسے قرآن نے اس ایجاز و اختصار سے ان چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ تم اگر غور کرو گے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ رسالتِ محمدیہ ایک حدِ فاصل ہے زمانۂ قدیم اور دورِ جدید میں۔ اس سے پہلے کی انسانی تاریخ دراصل ایک مسلسل داستان ہے ان گراں بار سلوں کی جن کے نیچے انسانیت بری طرح دب رہی تھی اور ان اطواق و سلاسل کی جن میں اس کا بند بند جکڑا ہوا تھا بایں ہمہ کہ وہ اپنی مرضی سے ایک قدم ادھر ادھر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ زنجیریں وہ تھیں جن میں انسان کا دل اور دماغ دونوں ماخوذ تھے ان سے نہ اس کے ذہن میں صحیح فکر پرورش پا سکتی تھی اور نہ ہی اس کے سینے میں حسین و خوشگوار جذبات کی بالیدگی ممکن تھی۔ قصۂ بنی اسرائیل میں دیکھو۔ قرآن نے ان مسیطرانِ نوعِ انسانی کا تذکرہ کس شرح و بسط سے کیا ہے۔ جو انسانی قلب و دماغ پر بری طرح مسلط رہتے ہیں۔ فرعون استبداد و ملوکیت کا مجسمہ (کہ جس کا نام آج تک بطور ضرب المثل استعمال ہوتا ہے) ہامان مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ (جس کی سحر کاری کی بنیاد پر قصرِ فرعونیت استوار تھا) اور قارون۔ سرمایہ داری کی لعنت کا نمائندہ (جس نے خود اپنی قوم کے لہو کا آخری قطرہ تک چوس لیا تھا)! اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے ہر سنگِ گراں انسانیت کی ہڈیاں توڑ دینے کے لئے کافی تھا۔ لیکن جس انداز سے مذہبی استبداد اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو رہا تھا اس کی مثال دوسرے شعبوں میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ رسالتِ محمدیہ کا سب سے بڑا معرکہ آرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فکرِ انسانی کو ان زنجیروں سے آزاد کیا۔ اس مقام پر شاید تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اسلام تو خود ایک مذہبی تحریک (RELIGIOUS MOVEMENT) ہے، اس لئے اس نے انسان کو "مذہب" کے شکنجے سے کس طرح چھڑا دیا؟ اگر کوئی دہریہ (ATHEIST) یہ کہے کہ میں نے فکرِ انسانی کو مذہب کی گرفت سے آزاد کرایا ہے تو اس کا یہ دعویٰ قابلِ فہم ہو گا۔ لیکن ایک مذہبی تحریک کا یہ دعویٰ کس طرح قابلِ پذیرائی سمجھا جا سکتا ہے؟ تمہارے دل میں اس خیال کا پیدا ہونا بجا ہے۔ لیکن حقیقت وہی ہے جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ یہ مقام ذرا مشکل ہے۔ اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مذہب کی دنیا میں بنیادی تصور خدا کا ہے۔ اس تصور کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ کسی قوم میں جس قسم کا خدا کا تصور ہو گا اس کے مطابق اس قوم کی تہذیب و معاشرت اور ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت ہو گی (خدا کے صحیح تصور کے متعلق میں کسی سابقہ خط میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اس وقت اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ) رسالتِ محمدیہؐ سے پہلے، مذاہب کی دنیا[2] میں خدا کا تصور ایک مستبد اور مطلق العنان حکمران کا سا تھا۔ جو نہ کسی قاعدے کا پابند تھا نہ قانون کا۔ جس کے ہاں نہ کوئی آئین تھا نہ دستور۔ وہ جو جی میں آئے کرتا تھا اور جس قسم کا جی چاہے حکم دے دیتا تھا۔ دنیا کے عام شاہنشاہوں کی طرح اس کی بھی یہ کیفیت تھی کہ (سعدیؒ کے الفاظ میں) گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت بخشند) اس کے ہاں سے اپنے عمل کی بنا پر بطور استحقاق کچھ طلب کرنا تکبر و نخوت سمجھا جاتا تھا اس لئے کہ وہ جسے کچھ دیتا تھا اپنی خوشی سے بطور احسان دیتا تھا۔ لہٰذا انسان کی ہر وقت کوشش یہ رہتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے (انسانی بادشاہوں کی طرح) اسے خوش کرنے کے لئے کبھی اس کی شان میں حمد و ستائش کے قصیدے پڑھے جاتے تھے اور کبھی اس کے حضور گڑگڑا کر رحم کی درخواستیں گزاری جاتی تھیں۔ کبھی اس کی بارگاہ میں نذرانے پیش کئے جاتے تھے اور کبھی اسے قربانیوں سے خوش کیا جاتا تھا۔ پھر دنیاوی بادشاہوں کی طرح، خدا کا دربار بھی ہوتا تھا جس میں "مقربین" اس کے گرد و پیش بیٹھتے تھے۔ باہر حاجب و دربان ہوتے تھے۔ لہٰذا عام انسان کے لئے اس تک براہ راست پہنچنا ناممکن تھا۔ اسے خدا تک اپنی بات پہنچانے کے لئے وسیلے ڈھونڈتے پھرتے اور سفارشیوں کی تلاش کرنی پڑتی تھی۔ یہ سفارشی وہ مقرب تھے جو خدا کے دربار میں موجود رہتے تھے ان کی سفارش سے عوام کے کام نکلتے تھے۔ عوام کو ان کی سفارش حاصل کرنے کے لئے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا تھا۔ غرضیکہ اس قسم کا خدا اور اس کے یہ تمام مقربین، انسان کے لئے مستقل ہوا بنے رہتے تھے۔

تم غور کرو سلیم! کہ اگر کسی ذی احساس انسان کو اس قسم کے بادشاہ کے زیرِ حکومت چار دن بھی گزارنے پڑیں تو اس کی حسِ انسانیت کا حشر کیا ہو گا؟ اور اگر اسے اس دنیا کی پوری زندگی اور اس کے بعد کی زندگی دونوں اس قسم کے خدا کی حکومت میں بسر کرنی پڑے جس میں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہے کہ

اب چھری صیاد نے لی — اب قفس کا در کھلا

تو اس میں اس کی کیفیت کیا ہو گی؟ یہ تھیں وہ ناقابلِ برداشت پتھر کی سلیں جن کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی۔ اور یہ تھیں وہ استخواں شکن زنجیریں جن میں انسان جکڑا ہوا تھا۔ رسالتِ محمدیہؐ نے آ کر خدا کا ایسا تصور دیا جس سے مجبور و مقہور انسان ان تمام اغلال و سلاسل سے آزاد ہو کر شرفِ انسانیت سے ہم آغوش ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ بیشک خدا، لامتناہی قوتوں کا مالک اور اپنے ارادے اور فیصلے میں مختارِ مطلق ہے۔ لیکن اس نے نظم و نسقِ کائنات اور انسانی

---

[1] مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۵۳ء

[2] اس سے مراد وہ تصور ہے جو مذاہب میں رائج تھا ورنہ حضرات انبیائے کرام نے خدا کا صحیح تصور ہی دیا تھا۔ ان کی تعلیم میں تحریف کی وجہ سے یہ صحیح تصور باقی نہیں رہا تھا۔

سعی و عمل کے نتائج کے لئے ایسے اٹل قوانین بنا دیئے ہیں جن میں کہیں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (۲۵/۲) اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اس کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے۔ یہ "قدر" یا پیمانے ہی ہیں جنہیں دور حاضر کی اصطلاح میں قانون (LAW) کہا جاتا ہے (قانون یا LAW سے مراد وہ قانون نہیں جس کی عدالتوں میں مٹی پلید ہوتی ہے۔ بلکہ وہ قانون جس کے مطابق کارگہ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے) قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳) یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے ہر شے کے لئے ایک قانون بنا دیا ہے۔ لہذا یہاں کسی مستبد حاکم کی مطلق العنانی کارفرما نہیں۔ یہاں ہر کام قاعدے اور قانون اور آئین و دستور کے مطابق ہوتا ہے۔ جسے ہم "امر اللہ" یا خدا کا حکم کہتے ہیں۔ خود اس کے لئے بھی قانون مقرر ہے۔ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸)۔ ظاہر ہے سلیم! جہاں ہر کام قانون کے مطابق سرانجام پاتا ہو وہاں نہ کسی کی خوشامد و درآمد کی ضرورت ہوتی ہے نہ رشوت اور نذر لانے کی۔ وہاں نہ کسی وسیلے کی احتیاج ہوتی ہے نہ کسی سفارشی کی تلاش وہاں نہ کسی سے بے انصافی ہوتی ہے۔ نہ کسی کی رُو رعایت اس انداز حکومت میں، لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸) پھر یہ قانون بھی اس طرح نتیجہ خیز ہوتا ہے جس طرح سنکھیا کھانے سے ہلاکت اور پانی پینے سے پیاس کی تسکین ہو جاتی ہے۔ اس میں نہ کسی عدالت میں جانے کی ضرورت پڑتی ہے نہ کورٹ فیس لگانے کی حاجت نہ گواہ بلانے کا مطالبہ ہوتا ہے نہ دستاویزیں پیش کرنے کا تقاضا۔ ادھر عمل سرزد ہوا ادھر اس کا نتیجہ مرتب ہونا شروع ہو گیا اور اس بات کا انسان کو اس کا اختیار دیدیا گیا کہ وہ جس قسم کا چاہے عمل کرے۔ جو نسا راستہ جی میں آئے اختیار کرے۔ جو رستہ وہ اختیار کرے گا اس کے مطابق منزل سامنے آجائے گی۔

سوچو سلیم! کہ اس قسم کی فضا میں انسان کو کس قدر حریت اور آزادی نصیب ہوتی ہے اور اس کی پیشانی میں سربلندیوں اور سرفرازیوں کے کتنے عظیم عرش جھلک اٹھتے ہیں۔ اس میں قانون کی اطاعت کرنی ہوگی اور بس۔ اس میں کسی فرد کی غلامی اور محکومی کا سوال ہی نہیں ہوگا۔ نہ ہی وہ تذبذب اور اضطراب جو مستبد شہنشاہ قسم کے "خدا" کے تصور کے تحت ہر وقت سینۂ آدم میں آتش خاموش کی طرح سلگتا رہتا تھا کہ معلوم وہ کس بات سے ناراض ہو جائے اور اس کا نتیجہ کیا ہو؟ اب ہر شے کے پیمانے مقرر ہیں۔ ان پیمانوں (قوانین) کا علم حاصل کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں عمل کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد آپ کا ہر قدم حتم و یقین کے ساتھ اٹھے گا اس حتم و یقین کے ساتھ کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے جس قانون کا سررشتہ میں نے تھاما ہے وہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ تمہیں سلیم! وہ رستے کا پل (Rope- Way) یاد ہے جس میں ہنڈولا لٹکا کر اس میلوں گہری کھڈ کو عبور کیا کرتے تھے۔ جب وہ ہنڈولا عین بیچ میں جاتا تھا اور نیچے کھڈ کا بھیانک اندھیرا نظر آتا تھا تو وہ سماں کس قدر ہولناک ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم لوگ کس ہنسی خوشی سے ادھر سے اُدھر آیا جایا کرتے تھے۔ یہ اطمینان کس چیز سے حاصل تھا؟ صرف اس سے کہ اس کا رسہ اس قدر مضبوط ہے کہ وہ کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ وہ درمیان میں جا کر دھوکا نہیں دے گا۔ بس ایسا ہی اطمینان اس قانون کی اطاعت سے ہوتا ہے جس کے متعلق یقین ہو کہ وہ کبھی دغا نہیں کرے گا کبھی ٹوٹیگا نہیں۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶) جس نے ہر غیر خداوندی قانون سے منہ موڑ کر صرف قانون خداوندی پر بھروسہ کر لیا تو اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اور پھر اس "قانون کی اطاعت" پر بھی کسی تھانیدار کے حکم کی اطاعت نہیں بلکہ ایک ڈاکٹر کی ہدایات کی تعمیل ہے۔ اسے درحقیقت نہ حکم کہا جا سکتا ہے نہ اس کی تعمیل کو اطاعت یا فرماں پذیری۔ جو ان ہدایات کی تعمیل کرے گا وہ بیماری سے محفوظ رہے گا۔ جو ان کے خلاف جائے گا، اس کی صحت تباہ ہو جائے گی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲/۳۹)

کائنات میں قانون کی کارفرمائی کے تصور نے ہر قسم کی توہم پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں کوئی حادثہ یونہی ہنگامی طور پر رونما نہیں ہوتا بلکہ سلسلۂ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے مطابق ہوتا ہے۔ اس حقیقت نے ہر ذہن کو دعوت غور و فکر دی اور اس طرح، خدا کے اس صحیح تصور سے سائنٹفک دور کا آغاز ہو گیا اور علم انسانی کے لئے تحقیق و کاوش کے لا انتہا راستے کھل گئے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ خدا کے تصور میں اس بنیادی تبدیلی سے، رسالت محمدیہ نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور اس کے قلب و اذہان سے کس کس قسم کا بوجھ اتار کر اسے صحیح انسانیت کی آزادی عطا کر دی۔

مذہب کی دنیا میں خدا کے بعد رسول کا درجہ آتا ہے۔ رسالت محمدیہ سے پہلے، اقوام عالم نے اپنے اپنے مذہب کے بانیوں کو انسانی سطح سے اٹھا کر، خدائی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ ہندو اپنے رشیوں کو پرمیشور کا اوتار مانتے تھے۔ زرتشتیوں کا پیشوا خود خدا مانا جاتا تھا۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا ہی نہیں بلکہ خدائی میں تیسرے حصے کا شریک قرار دے رکھا تھا۔ علاوہ اس کے کہ یہ چیز علم و حقیقت کے خلاف تھی، ذہن انسانی پر اس کا اثر یہ تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ بڑے بڑے کارنامے جو ان بزرگوں سے سرزد ہوئے دوسرے انسانوں سے عمل میں نہیں آ سکتے۔ کیونکہ وہ مافوق البشر قوتوں کے حامل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ اقوام اپنی نشاۃ ثانیہ (تازہ حیات قومی) کے لئے

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

معراج انسانیت (از پرویز) سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر ' نئے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیز ڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش قیمت [illegible]

ابلیس و آدم (از پرویز) سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصہ آدم جنات ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۰۷ صفحات ——— قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں کی تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں؛ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؛ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام (از پرویز) نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب بڑے سائز کے ۴۰۰ صفحات ——— قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے روز مرہ کی زندگی کے سامنے اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث ۴۰۰ صفحات ——— قیمت چار روپے

اسباب زوال امت (از پرویز) مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو ترانیس صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے ایسے عنوانات میں جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سسکتی ہوئی تاریخ ۲۰۰ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

کسی مافوق البشر آنے والے" کا انتظار کرتی تھیں۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ کام ہم لوگوں سے ہو ہی نہیں سکتا۔ تم سمجھتے ہو سلیم! کہ اس عقیدہ کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ تو بہ فکر اور عمل دونوں اعتبار سے قامتِ انسانیت (HUMAN STATURE) تک پہنچ ہی نہ سکیں ان کے اعصاب پر ہر وقت جذبۂ مرعوبیت (INFERIORITY COMPLEX) سوار رہتا تھا جو ان کے مضمر جوہروں میں بالیدگی پیدا ہی نہیں ہونے دیتا تھا۔

رسالتِ محمدیہ نے آکر اعلان کیا کہ "انا بشر مثلکم۔ یوحیٰ الیّ" اس خصوصیت کو چھوڑ کر کہ نبی کو خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے، وہ تمہارے ہی جیسا انسان ہوتا ہے۔ لہٰذا (وحی کے علاوہ) جو انقلاب اس نے برپا کیا تھا وہ تم بھی کر سکتے ہو۔ اس کے لئے کسی مافوق البشر قوت و استعداد کی ضرورت نہیں۔ رسول کی زندگی تمہارے لئے اس اعتبار سے نمونہ تھی ہے کہ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ تمہارے لئے نا ممکن الحصول یا ناممکن العمل نہیں۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسول کے تصور میں اس تبدیلی نے انسان کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر کس طرح آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا؟ لیکن رسالتِ محمدیہ تو اس سے بھی ایک قدم آگے چلی گئی۔ اس سے پہلے انسان اپنے عہدِ طفولیت میں تھا۔ جہاں اسے قدم قدم پر کسی انگلی پکڑنے والے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں انبیاء کا سلسلہ پیہم و متواتر جاری رہا۔ لیکن رسالتِ محمدیہ نے اعلان کر دیا کہ اب سلسلہ نبوت ختم ہو گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اب انسانوں کو اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے ہوں گے اتنا دیکھتے ہوئے کہ ان کا کوئی فیصلہ ان غیر متبدل اصولوں کے خلاف نہ جائے جو وحی نے عطا کئے ہیں اور جو اب قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ انسانیت کی تاریخ میں ختمِ نبوت کا اعلان ایک بہت بڑا انقلاب ہے۔ اس سے انسانی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور یہ اعلان (معاذ اللہ) کسی منکرِ نبوت کی طرف سے نہیں ہوا۔ ختمِ نبوت کا اعلان خود زبانِ نبوت سے ہوا ہے۔ یہ اعلان ہے اس حقیقت کا کہ اب انسان سنِ شعور کو پہنچ گیا ہے اور اسے صرف اتنی راہ نمائی کی ضرورت ہے کہ ہر دوراہے پر معلوم ہو جائے یہ راستہ کس طرف جاتا ہے اور وہ راستہ کس سمت کو۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسالتِ محمدیہ نے اس باب میں بھی کس قدر حریتِ فکر و عمل اور خود اعتمادی و خود فیصلگی عطا کی ہے؟

مذہب کی دنیا میں تیسری چٹان یا زنجیر (زنجیر کیا پورے کا پورا جیل خانہ!) پیشوائیت کی لعنت ہے (جسے انگریزی میں (PRIESTHOOD) ہندوؤں کے ہاں برہمنیت، اور ہمارے ہاں ملّائیت کہا جاتا ہے)۔ یہ وہ زنجیریں ہیں جو انسان کو ایک قدم بھی اپنی مرضی سے اٹھانے نہیں دیتیں۔ یوں بیٹھو، یوں اٹھو۔ یوں سوؤ، یوں جاگو۔ یوں چلو، یوں پھرو۔ یوں کھاؤ، یوں پیو۔ دایاں پاؤں ادھر رکھو بایاں اُدھر۔ سیدھا ہاتھ یوں اٹھاؤ، الٹا یوں۔ پوری کی پوری زندگی ایک فوجی ڈسپلن کی (REGIMENTATION) بنا دی جاتی ہے۔ سوچو سلیم! کہ انسانیت پر یہ بوجھ کس قدر گراں اور یہ زنجیریں کیسی استخواں شکن تھیں۔ رسالتِ محمدیہ نے ان تمام زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی۔ قانون کی اطاعت میں پیشوائیت کا کیا کام!

اس سے آگے بڑھئے تو مذہب کی دنیا میں "نجات" کا تصور سامنے آتا ہے۔ اسے درحقیقت مذہب کا مقصود و منتہیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ خود لفظِ نجات اس کی غمازی کرتا ہے کہ انسان کسی جیل خانے میں محبوس یا سخت زنجیروں میں مقید ہے اور ان زنجیروں سے رہائی حاصل کرنا نجات ہے۔ رسالتِ محمدیہ نے اس کا اعلان کیا کہ نجات کا یہ تصور غلط ہے۔ انسان کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کہ اسے اس سے نجات دلائی جائے۔ اسے کچھ قوتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں اور ممکنات کی ایک وسیع دنیا اس کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد اس سے کہہ دیا گیا ہے کہ یہ اپنی سعی و عمل سے جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے کرے۔ جو جس قدر نتائج حاصل کرے گا، اتنا ہی کامیاب و کامران ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زندگی کا مقصود نجات کی بجائے فلاح و فوز قرار دیا ہے۔ فلاح کے معنی ہیں کھیتی کا پروان چڑھنا، مجنوں کا ثمربار ہونا۔ اور فوز کے معنی ہیں (ACHIEVEMENT) ان صلاحیتوں کی نشو و نما جن سے زندگی اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جائے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسالتِ محمدیہ نے یک جنبش ان محکم زنجیروں کو کس طرح تارِ عنکبوت بنا کر رکھ دیا!

مذہب کی دنیا سے آگے بڑھ کر معاملات کی دنیا میں آیئے تو ملوکیت کا استبداد نوعِ انسانی کے سر پر ہمالیہ سے زیادہ گراں بار پہاڑ تھا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ رسالتِ محمدیہ نے نوعِ انسانی کو یہ انقلاب آفریں پیغام دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ انسانوں کو اپنے معاملات قوانینِ خداوندی کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں جو ان میں سے ان قوانین و ضوابط کی نگہداشت سب سے زیادہ کرتا ہے۔ وہ ان میں سب سے زیادہ واجب التکریم ہے۔

ملوکیت کی غلامی سے بھی زیادہ کرب انگیز اور انسانیت سوز غلامی، اقتصادی غلامی (ECONOMIC SLAVERY) ہے۔ نوعِ انسانی اس قدر مدتِ مدید سے اس غلامی میں جا خود چلی آرہی تھی کہ غلاموں کو اپنی غلامی کا احساس تک بھی باقی نہیں رہا تھا۔ رسالتِ محمدیہ نے آکر اعلان کیا کہ خدا نے زمین کے دسترخوان پر رزق کو اس لئے بکھیر رکھا ہے کہ اس سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہو سکے۔ لہٰذا کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ رزق کے سرچشموں پر ذاتی قبضہ جمائے۔ یہ معاشرہ کی تحویل میں رہنے چاہئیں اور معاشرہ کو تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہونا چاہیئے۔

اس مقام پر سلیم! ممکن ہے تمہارے دل میں ایک سوال پیدا ہو جس کا جواب ضروری ہے۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب کوئی قوم رزق کی طرف سے مطمئن ہو جائے تو اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ زندگی کی حرارت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اگر قرآنی نظام کے ماتحت افرادِ معاشرہ کو حصولِ رزق کی کشمکش سے نجات دلا دی جائے تو کیا ان کی بھی یہی حالت نہ ہو جائے گی؟ یہ اعتراض بڑا معقول نظر آتا ہے اور تاریخِ اقوام انسان کو اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ لیکن سلیم! اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کا مقصود صرف حصولِ رزق رکھا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی حیاتِ طبیعی کا نام ہے اور جب اسے اس زندگی کی بقا کا سامان (رزق) میسر آجائے تو اس کے بعد اس کے سامنے کوئی اب مقصد نہیں

سالمارین
دردوں کیلئے
گھٹیا، رنگین، درد کمر، ریاحی درد، دردِ شقیقہ سردرد، اور زہریلے جانوروں کے کاٹے کے لئے اکسیر ہے۔
انتہائی درد کی بے چینی کو فوراً دور کر کے سکون پہنچاتی ہے۔
اس کا مسلسل استعمال دائمی آرام کا ضامن ہے۔
ہوائی جہاز، ریل، اور بحری جہاز میں سفر کرنے والوں کے لئے سالمارین بہترین دستی مددگار ہے
قیمت فی شیشی دو روپے علاوہ محصول ڈاک
اپنے شہر کے ہر اچھے دوا فروش سے خریدیں
یا
سالما لیبارٹریز (پاکستان)
۲۷ زینت مینشن ۔ میکلوڈ روڈ ۔ کراچی

رہ جاتا جس کے حصول کے لئے اسے جد و جہد کرنی پڑے۔ یہ وجہ ہے کہ جب کوئی قوم رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہے تو اس کی قوتوں میں اضمحلال شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے طبعی زندگی کو محض حیوانی سطح کی زندگی قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ مقصود و منتہائے انسانیت نہیں اس نے انسان کے سامنے اس سے کہیں بلند اور وسیع مقاصد رکھے ہیں۔ ان کی تفصیل میں تمہیں مختلف مواقع پر بتا چکا ہوں اس لئے ان کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں، قرآن نے یہ دیکھا کہ انسان کی یہ کس قدر بدنصیبی ہے کہ اس کی ساری توانائیاں محض حصولِ رزق میں ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ ان سے بلند مقاصد کی طرف توجہ ہی نہیں دے سکتا۔ اس نے اسے روٹی کی طرف سے مطمئن کر کے اس کی تمام توانائیوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے محفوظ (CONSERVE) کر لیا اور اس سے کہدیا کہ وہ اپنی تمام توجہات کو ان مقاصد پر مرکوز کر دے اور اس طرح " اقطار السمٰوٰت والارض " سے آگے نکل جانے کی کوشش کرے۔ ذرا غور کرو سلیم! کہ رسالتِ محمدیہ نے اس ایک تبدیلی سے عالمِ انسانیت میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے انسان کی تمام توانائیوں کو جو حصولِ رزق جیسے اسفل مقصد ہی میں ضائع ہو جاتی تھیں محفوظ کر لیا۔ لیکن رزق کی طرف سے اطمینان ہو جانے سے انسان میں جو تعطل پیدا ہو جاتا تھا اس کے سامنے بلند ترین مقاصد رکھ کر نہ صرف اس تعطل کو دور کر دیا۔ بلکہ اس کی زندگی کو جہادِ مسلسل میں تبدیل کر دیا۔ ایسا مسلسل جہاد ہیں کہ جانے والی نسل جس حد تک راستہ طے کر جائے آنے والی نسل کے لئے وہ مقام، سفر کا نقطۂ آغاز بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ماضی کی طرف نگاہ رکھنے کے بجائے ہمیشہ مستقبل کو سامنے رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسی کا نام **ایمان بالآخرت** ہے۔ اور یہ بجائے خویش بہت بڑا انقلاب ہے جسے رسالتِ محمدیہ نے انسانی نگاہ میں پیدا کیا ہے۔ یعنی ہمیشہ نگاہ مستقبل پر رکھنی۔ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔

خط لمبا ہو گیا ہے لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے میں اس خصوصیتِ کبریٰ کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک رسالتِ محمدیہ کا نوعِ انسانی پر احسانِ عظیم ہے۔ تم غور کرو سلیم! کہ انسان اپنی طبعی دنیا میں نسلاً بعد نسلٍ ترقی کرتا ہوا کس طرح آگے بڑھتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ مثال کے طور پر امراض اور ان کے علاج کے شعبہ ہی کو دیکھو۔ جن امراض کو آج سے چند صدیاں پہلے لاعلاج سمجھا جاتا تھا۔ (بلکہ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ امراض ہیں کیا) ان پر انسان کس طرح قابو پاتا چلا جا رہا ہے۔ پھر طریقِ علاج پر غور کرو۔ ابھی پچاس سال پہلے دانت نکلوانا اس قدر کرب انگیز تھا کہ آج اس کے تصور سے کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن آج ایک دانت تو کیا، پورے کا پورا جبڑہ اس طرح نکال کر رکھ دیا جاتا ہے کہ آدمی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ کب ہو گیا۔ اس طرح سرجری (جراحی) کی دوسری مثالوں کو سمجھ لو۔ اب تم غور کرو کہ پچھلی صدی کے انسان کے لئے یہ تصور کس قدر یاس انگیز اور حسرتناک ہوگا کہ میں یونہی سو سال پہلے پیدا ہو گیا اگر میں بھی بیسویں صدی میں پیدا ہوتا تو اس تمام کرب و درد سے بچ جاتا جن میں میں مختلف امراض اور ان کے علاج کی وجہ سے مبتلا رہا۔ یہ اس لئے ہے سلیم! کہ انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہے۔ وہ مختلف تجارب کے بعد رفتہ رفتہ انکشافِ حقائق کرتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس باب میں سابقہ نسل کا انسان، آنے والی نسل کی سطح سے نیچے رہ جاتا ہے۔ یہ اس کی بے بسی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

لیکن وحی کا طریق تجرباتی نہیں۔ اس کی رُو سے تمام وہ حقائق جو انسانیت کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں، بیک وقت نوعِ انسانی پر نبی کے ذریعے منکشف کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سابقہ، موجودہ اور آنے والی نسل کے تمام انسان ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں اس میں کسی گذشتہ نسل کے انسان کو اس کا افسوس نہیں ہوتا کہ وہ آنے والی نسل سے پہلے کیوں پیدا ہو گیا؟ وہ بھی اسی مقام پر ہوتا ہے جس مقام پر آنے والی نسل کے انسان نے ہونا ہے۔ لہٰذا اس میں کسی دور کے انسان کے لئے وجہِ مایوسی اور احساسِ بے بسی نہیں ہوتا۔ وحی کی رُو سے عطا فرمودہ پروگرام سب کے لئے یکساں طور پر باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ جو قوم جس دور میں بھی اسے اختیار کرے اس کے سامنے وہی نتائج آ جاتے ہیں۔ چونکہ یہ پروگرام رسالتِ محمدیہ میں تکمیل تک پہنچ گیا اور ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا اس لئے رسالتِ محمدیہ تمام نوعِ انسانی کے لئے رحمت ہے وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ کا یہی مفہوم ہے۔

کیوں سلیم! کتنا بڑا ہے یہ احسان؟ اس کی سپاس گزاری میں تمام نوعِ انسانی کی گردن اس رحمۃ للعالمین کے حضور جھکنی چاہیئے یا نہیں؟ اب تم سمجھے کہ میں اس تقریبِ عظیم کو کیوں تمام دنیا کے انسانوں کے لئے سب سے بڑا جشنِ مسرت قرار دیتا ہوں؟

سلیم! دنیا نے ابھی تک رسالتِ محمدیہ کی غایت و مقصود کو سمجھا ہی نہیں۔ لیکن اس میں دنیا والوں کا کیا قصور؟ ہم انہیں سمجھاتے تو وہ سمجھتے!

اور اس کے جواب میں تم کہو گے کہ اس میں ہمارا بھی کیا قصور؟ ہم خود سمجھتے تو دوسروں کو بھی سمجھاتے!

بہرحال۔ اب تو تم سمجھ گئے کہ رسالتِ محمدیہ کس طرح رحمۃ للعالمین ہے؟ میری طرف سے تمہارے لئے عیدِ میلاد النبی کا یہی سب سے بڑا تحفہ ہے

والسّلام
پرویز (اکتوبر ۱۹۵۵ء)

علمِ نبوی

احادیث کی رو سے

[ذیل کی احادیث بخاری شریف کی ہیں۔ اردو ترجمہ مرزا حیرت دہلوی کا ہے جس کے طابع و ناشر "نور محمد - تاجر کتب - کراچی - ہیں۔ پہلے صفحہ کا نمبر ہے اور بعد میں حدیث کا نمبر۔ طلوعِ اسلام]

بخاری جلد دوم

(۳۰۸) حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوذر سے جبکہ آفتاب غروب ہو رہا تھا یہ فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ یہ کہاں جاتا ہے میں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول خوب واقف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جاتا ہے تاکہ عرش کے نیچے سجدہ کرے پھر اللہ سے) اجازت طلوع کی مانگے گا تو اسے اجازت طلوع کی دیجائے گی اور قریب ہے کہ وہ سجدہ کرے اور اس کا سجدہ قبول نہ کیا جائے اور اجازت مانگے اور اسے اجازت نہ ملے اس سے کہدیا جائے کہ جہاں سے تو آیا ہے وہیں لوٹ جا پس وہ مغرب سے طلوع کرے گا۔ یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ

(۴۹۰) حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار میرے ایک حصہ نے میرے دوسرے حصہ کو کھا لیا تو اللہ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دیدی ایک سانس جاڑوں میں اور ایک سانس گرمی میں (یعنی جب دوزخ اندر کو سانس کھینچتا ہے تو سردی کا موسم آجاتا ہے اور جب باہر کو سانس لیتا ہے تو گرمی کا موسم آجاتا ہے۔)

(۵۰۹) حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا اثر ہوا۔ آپ کو خیال ہوتا تھا کہ ایک کام کیا ہے حالانکہ آپ نے اس کو نہ کیا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ نے ایک دن دعا کی اور بہت دعا کی بعد اس کے (مجھ سے) فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے مجھے وہ بات بتا دی جس میں میری شفا ہے دو آدمی میرے پاس آئے ان میں سے ایک میرے سر کے پاس اور دوسرا میرے پیروں کے پاس بیٹھ گیا پھر ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس شخص کو کیا بیماری ہے دوسرے نے کہا کہ ان پر جادو کیا گیا ہے اس نے کہا کہ کس نے ان پر جادو کیا دوسرے نے کہا کہ لبید بن اعصم نے اس نے کہا کہ کس چیز میں دوسرے نے کہا کہ کنگھی میں اور روئی کے گالے میں اور ترکھجور کے کلی کے اوپر والے چھلکے میں اس نے کہا کہ وہ کہاں ہے دوسرے نے کہا کہ ذوران (نامی) کنوئیں میں پس وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے بعد اس کے لوٹے تو جب لوٹ آئے تو آپ نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ اس کنوئیں (کے قریب والے) درخت گویا کہ شیاطین کے سر ہیں (حضرت عائشہ کہتی ہیں) میں نے کہا کہ آپ نے اس کو نکلوا لیا فرمایا کہ نہیں اللہ نے تو مجھے شفا دیدی اور اس کے نکلوانے میں مجھے یہ خیال ہوا کہ لوگوں میں فساد پھیلے گا اور جادو کا چرچا زیادہ ہو جائے گا بعد اس کے وہ کنواں بند کر دیا گیا۔

(۵۲۹) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ سے اس کا فضل طلب کرو کیونکہ وہ فرشتے کو دیکھتا ہے (تب بولتا ہے) اور جب تم گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے خدا کی پناہ مانگو کیونکہ وہ شیطان کو دیکھتا ہے تب بولتا ہے۔

(۵۳۱) حضرت ابوہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ایک گروہ بنی اسرائیل کا کھو گیا نہیں معلوم کیا ہوا میں خیال کرتا ہوں کہ یہ چوہے وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھ دیا جاتا ہے تو وہ نہیں پیتے اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھ دیا جاتا ہے تو وہ پی لیتے ہیں۔ پھر میں نے کعب سے یہ حدیث بیان کی تو انہوں نے کہا تم نے خود نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے میں نے کہا ہاں

قرآن کی رُو سے

سُورۃُ النجم صفحہ ۵۳

تمہید اے قوم مخاطب! تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ وحی کی جس راہ نمائی کی طرف تمہیں دعوت دی جا رہی ہے وہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے؛ وہ سفرِ زندگی میں کہیں دھوکا تو نہیں دے جائے گی؟ وہ غلط راستے پر تو نہیں ڈال دے گی؟ وہ کسی مقام پر جا کر ساتھ تو نہیں چھوڑ دے گی؟ ---- ان سے کہو کہ تم جب راتوں کو صحرا میں سفر کرتے ہو، جہاں کوئی پختہ رستہ یا نشانِ راہ نہیں ہوتے تو تم اپنی راہ نمائی کہاں سے حاصل کرتے ہو۔ تم ستاروں کو دیکھ کر سفر کرتے ہو۔ تم بتاؤ کہ ان کی راہ نمائی کے متعلق تمہارا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے؟ کیا ان کی راہ نمائی قابلِ اعتماد ہے۔ یا یہ اپنی روش بدل کر دھوکا بھی دیدیتے ہیں؟ تمہارا جو جواب ستاروں کی راہ نمائی کے متعلق ہے وہی جواب وحی کی راہ نمائی کے متعلق سمجھ لو۔ اس لئے کہ رسول کو وحی بھی اسی مقام سے ملتی ہے جہاں سے ستاروں کو اپنی محکم روش پر چلنے کی راہ نمائی ملتی ہے۔

ستارہ جو اپنی محکم روش پر چلتا چلتا ایک خاص رستہ طے کر کے، ایک خاص مقام پر غروب ہو جاتا ہے۔ اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہے کہ تمہارا رفیقِ راہ (رسول) جو سفرِ زندگی میں تمہاری راہ نمائی کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ نہ تو راستے کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے اور نہ ہی اسے کہیں دھوکا لگا۔ سکتا ہے (وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى)

اس لئے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اپنے خیالات وجذبات کی رُو سے نہیں کہتا بلکہ وہی بات کہتا ہے، جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہیں (قرآن وحی کا مجموعہ ہے۔ رسول کے ذاتی خیالات کا نہیں) (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى)

اسے یہ وحی اس خدا کی طرف سے ملتی ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے اور زندگی کی تمام گذرگاہوں سے واقف (عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۔ ذُوْ مِرَّةٍ)

اس وحی نے رسول کی ذات میں پورا پورا توازن قائم کر دیا (فَاسْتَوٰى) وہ علم کی ان بلندیوں تک جا پہنچا جہاں عقلِ انسانی کی رسائی ممکن نہیں۔ (وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى)

وہاں (علم کے افقِ مبین پر) پہنچ کر وہ حقائقِ کائنات سے قریب تر، اور ضمیرِ حیات کی گہرائیوں میں اتر کر اس سے یکسر ہم رنگ ہو جاتا ہے۔ (ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى)

ان قوانینِ الٰہیہ سے ہم رنگ ہو کر وہ اس طرح خدا کا رفیق بن جاتا ہے جس طرح تم باہمی رفاقت اور توثیقِ عہد کے لئے دو کمانوں کو اس طرح ملاتے ہو کہ وہ ایک قاب دار بن جاتی ہیں اور پھر دونوں کو ملا کر اکٹھا تیر چلاتے ہو[1]۔ (فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ) بلکہ رسول کی رفاقت وہم آہنگی اس سے بھی گہری ہوتی ہے (اَوْ اَدْنٰى)

اس طرح خدا نے اپنے بندے (رسول) کی طرف وہ کچھ وحی کر دیا جسے انسانی راہ نمائی کے لئے دینا مقصود تھا (فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى)

وہ (رسول) وحی کی رُو سے جو کچھ دیکھتا ہے اس میں اس کے اپنے جذبات وخیالات کسی قسم کی آمیزش نہیں کرتے (مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى)

اب بتاؤ کہ تم وحی کے حقائق کے متعلق اس سے کس طرح جھگڑ سکتے ہو جبکہ صورت یہ ہے کہ یہ جو کچھ کہتا ہے اپنی آنکھوں دیکھا کہتا ہے اور تم اس مقام کی کیفیت تک سے ناآشنا

---

[1] عربوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ وہ جب آپس میں عہدِ وفا باندھتے تو اپنی دو دو کمانوں کو ملا کر اکٹھا تیر چلاتے۔ اسے قابِ قوسین کہتے تھے۔

پھر انہوں نے مجھ سے مکرر یہی پوچھا تو میں نے کہا کہ کیا میں تورات پڑھا ہوا ہوں (یعنی تورات دیکھ کے بیان کرتا)

(۴۹۵) حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کسی کے کھانے پینے کی چیز میں مکھی گر جائے تو اسے چاہیئے کہ اسے غوطہ دیدے بعد اس کے اس کو نکال ڈالے کیونکہ اس کے دو پروں میں سے ایک پر میں بیماری ہے اور دوسرے میں شفا ہے۔

(۵۰۰) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اللہ نے جب آدم کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا پھر اللہ نے (ان سے) فرمایا کہ جاؤ اور ان فرشتوں کو سلام کرو اور سنو وہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہے پس آدم نے کہا السلام علیکم۔ فرشتوں نے جواب دیا السلام علیک ورحمۃ اللہ۔ ورحمۃ اللہ انہوں نے زیادہ کر دیا پس جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ آدم کی صورت پر ہوگا۔ پھر برابر اب تک قد کم ہوتا رہا۔

(۵۰۱) حضرت ابن عباس نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا برہنہ بدن بغیر ختنہ کے حشر کئے جاؤ گے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی کَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیم ہیں اور اس دن) میرے چند صحابہ بائیں جانب لے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابہ ہیں یہ تو میرے صحابہ ہیں پھر اللہ فرمائے گا یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے پس میں کہوں گا جیسا کہ نیک بندے (عیسیٰ) نے کہا تھا وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ (الی قولہ) الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

ہو! (أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ)

اس نے ان حقائق کو ایک بار ہی نہیں دیکھا۔ وہ انہیں بار بار دیکھتا ہے۔ اس کا یہ دیکھنا خواب کا دیکھنا نہیں جس میں انسان اپنے مشاہدہ کو دہرا نہیں سکتا۔ یہ حقائق کا خارجی شاہد ہے جو بار بار اس کے سامنے ہوتا ہے (وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ)

یہ مشاہدہ سرچشمۂ علم الٰہی کے قریب ہوتا ہے جہاں حیرت اپنی انتہا تک پہنچ جاتی ہے (عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَىٰ)

یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان کی مضمر صلاحیتیں کامل نشو و نما حاصل کر لیتی ہیں اور اسے زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب ہو جاتی ہیں، اسے جنت کا مقام کہا جاتا ہے عِندَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ۔

اس مقام حیرت پر علم خداوندی ہر طرف سے چھا رہا ہوتا ہے۔ (إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ)

اس علم کی روشنی میں نبی ان حقائق کا مشاہدہ اس طرح کرتا ہے کہ اس کی آنکھ نہ تو غلط سمت کی طرف مڑتی ہے اور نہ ہی اس مقام سے آگے نکل سکتی ہے جتنا علم اسے دیا جانا مقصود ہوتا ہے۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس لئے کہ رسول کو اس مقام حیرت سے لوٹ کر انسانوں کی دنیا کی طرف آنا ہوتا ہے تاکہ خدا کا پیغام ان تک پہنچا دے۔ (مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ)

اس طرح اس رسول نے اپنے نشو و نما دینے والے کی عظیم الشان نشانیوں کو دیکھا ہے (لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ)۔

یہ ہے علم نبوی کا مقام جس تک کوئی غیر از نبی نہیں پہنچ سکتا۔

زندگی روشنی ہے

اور

آنکھ اس روشنی کا چشمہ!

اس کی نگہداشت ہر انسان کا فرض اولین ہے

پس

فرض کی پورے طور پر سر انجام دہی کے لئے کسی ماہر فن کا مفید مشورہ ہی آپ کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔

ایشیاٹک آپٹیکل کمپنی

وکٹوریا روڈ ——— کراچی

۷۳ ڈلہوزی روڈ
راولپنڈی

اردو ادب میں عظیم نفسیاتی کتابوں کا اضافہ

آپ بھی خوش رہیئے

مصنفہ برٹرینڈ رسل مترجمہ شفیع الدین

آج کی دنیا اضطراب و بے چینی کی دنیا ہے۔ ہم طرح طرح کی ذہنی روحانی اور تخیلاتی اذیتوں کا شکار ہیں۔

برٹرینڈ رسل نے ان نفسیاتی بیماریوں اور کمزوریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کا علاج تجویز کیا ہے جس پر عمل کرنے سے ہم ان ذہنی بیماریوں سے نجات حاصل کر کے صحتمند تخیل اور خوشی کے جذبات و احساسات سے اپنے دل و دماغ کو لبریز کر سکتے ہیں۔

جب ہمارا دل و دماغ خوشی و مسرت کے جذبات سے معمور ہوگا۔ تو یاس و قنوطیت، افسردگی و پژمردگی اور رنج و الم جس کے پہاڑوں تلے ہم برسوں سے سسک رہے ہیں روئی کے گالوں کی طرح اڑتے ہوئے نظر آئیں گے اور ہمارے چاروں طرف مسرت و شادمانی اور کامیابی و کامرانی رقص کرتی ہوئی نظر آئے گی۔

صفحات ۳۶۰ مجلد۔ رنگین گرد پوش　　قیمت پانچ روپے

سوچئے اور دولت کمائیے

مصنفہ نپولین ہل۔ مترجمہ غوث صدیقی ایم۔ اے۔ یہ کتاب مشہور ماہر نفسیات نپولین ہل کا وہ شاہکار ہے جس نے لاکھوں انسانوں کی ناکام زندگی اور غربت و افلاس کو کامیاب زندگی اور دولت و امارت سے بدل دیا۔

یہ کتاب نہایت قیمتی معلومات کا خزانہ ہے اور اس کے مطالعہ سے انسانی ذہن میں ایک ایسی قوت پیدا ہوتی ہے جو مایوسی اور تاریکی کے جذبات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے ترقی کی راہیں کھولتی ہے۔ ہر وہ انسان جو اپنی افلاس کی زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ کتاب شمع راہ کا کام دے گی

صفحات ۴۰۰ مجلد۔ رنگین گرد پوش قیمت پانچ روپے

نفیس اکیڈمی۔ بلاسس سٹریٹ۔ کراچی

سیرتِ مصطفیٰ اور روایات

(از:- ابنِ آدم)

پہلے ایک بات کی معافی چاہتا ہوں میں جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ اس میں ایک بات کی پہلے ہی معافی چاہتا ہوں وہ بات یہ ہے کہ کسی بات کا حوالہ نہیں دوں گا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ یہ کہ حریتِ فکر (FREE THINKING) کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود بہت سے حضرات ابھی تک شخصیتوں کی ذہنی غلامی سے پوری طرح نہیں نکل سکے ہیں ایک بالکل پھسپھسی سی بات اگر کسی ایسی شخصیت کی زبان سے نکلے جس سے ہمیں عقیدت ہے۔ تو وہ ہماری نگاہوں میں قابلِ غور ہو جاتی ہے۔ اور ہم اسے قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کی طرف سے دفاع کرنے اور اس کی تاویلات کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور معقول سے معقول بات کسی ایسے آدمی کے قلم سے نکلے۔ جس سے ہمیں عداوت ہے۔ یا کم از کم عقیدت نہیں تو ہم اسے لائقِ توجہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کا مذاق اڑانا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ گویا بات کو بات کی حیثیت سے نہیں دیکھتے۔ بلکہ کہنے والے کی میزانِ شخصیت پر تولتے ہیں۔ اگر زید نے کہا ہے تو بالکل ٹھیک ہے۔ اس کی تائید کرنی چاہیئے۔ اور اگر بکر نے لکھا ہے تو یقیناً نامعقول ہی بات ہوگی۔ لہٰذا اس کی تردید بھی اہم فرائض میں داخل ہے میں نہایت صفائی سے اعتراف کرتا ہوں کہ باوجود کوشش کے میں خود بھی ابھی تک اس کمزوری سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا ہوں۔

اگر میں حوالہ دے کر یہ لکھوں کہ "فلاں روایت ابن ہشام یا ابن اسحٰق کی محلِ نظر ہے۔" تو شاید عام لوگ اس کی طرف خاص توجہ نہ دیں۔ لیکن یہ لکھ دوں کہ "یہ بخاری شریف کی روایت ہے اور محلِ نظر ہے۔" تو پورا اہلِ حدیث طبقہ برانگیختہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر یہ لکھ دوں کہ مولانا شبلی نے "سیرت النبیؐ" میں یا مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے "اصح السیر" میں یوں لکھا ہے اور یہ محلِ نظر معلوم ہوتا ہے۔ تو پورا شبلی اسکول یا وہ طبقہ جو مولانا عبدالرؤف کا ہم خیال ہے۔ توجیہاتی جوابات دینا شروع کر دے گا۔ اس لئے میں آپ سے سب سے پہلے اس بات کی معافی چاہتا ہوں کہ میں کسی عبارت کا حوالہ نہیں دوں گا مگر یہ یقین رکھئے کہ کوئی بات غلط اور بے سند نہیں لکھی گئی ہے۔ اگر شک ہو تو خط لکھ کر پوچھ لیجئے۔ حوالہ لکھ کر بھیج دیا جائے گا۔ ہماری غرض صرف یہ ہے کہ اپنے اسلاف کبار کی طرح ہم شخصیتوں سے بلند و بالا رہ کر بھی آزاد طریق پر بات کو بات کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی بنیں انظر الی ماقال ولا تنظر الی من قال۔ ایک بڑا اور اہم اصول ہے۔ یعنی یہ دیکھو کہ کیا کہا گیا۔ یہ نہ دیکھو کہ کس شخص نے کہا چنانچہ اسی اصول کے پیشِ نظر ہم یہاں چند باتیں درج کریں گے جن کو عام طور پر قدیماً و حدیثاً سب سیرت نگار لکھتے چلے آئے ہیں۔ لیکن یہ "باتیں" ہماری نگاہوں میں بعض وجوہ سے محلِ نظر ہیں۔ مثلاً

(۱) حضورؐ کا پناہ طلب کرنا سنہ … میں حضورؐ طائف تشریف لے گئے۔ وہاں بے انتہا اذیتیں حضورؐ کو پہونچائی گئیں۔ وہاں سے واپسی میں ایک شب مقام نخلہ میں قیام فرمایا۔ اور صبح مکے میں یوں تشریف لائے کہ "مطعم بن عدی سے حضورؐ نے پناہ مانگی اور اس نے پناہ دیدی۔" یہ سنہ … نبوت کا واقعہ ہے۔

مجھے یہ روایت محلِ نظر معلوم ہوتی ہے، حضورؐ کی سیرت استقامت، خودداری اور کردار سے یہ بہت بعید ہے کہ مکے میں آنے سے پہلے ایک کافر مطعم بن عدی سے پناہ طلب کی۔ اور اس کے پناہ دینے کے بعد حضورؐ مکے میں تشریف لائے۔ اس واقعے سے پہلے مکے میں پورے دس سال کی نبوی زندگی ساری کی ساری ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ اس عرصے میں بڑی سے بڑی آزمائشیں ہوئیں لیکن کسی سے بھی پناہ طلب کرنے کا کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ خود طائف میں حضورؐ نے کسی سے پناہ نہیں طلب کی۔ حالانکہ وہاں شدید اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تین سال تک شعبِ ابی طالب میں محصور رہ کر سخت سے سخت امتحان اور معاشری مقاطعے کا مقابلہ کیا۔ لیکن کسی سے پناہ طلب نہیں کی۔ حتیٰ کہ جب ابوطالب نے حضورؐ سے یہ فرمائش کی کہ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو تو حضورؐ نے ابوطالب کو صاف جواب دے دیا کہ اگر تمہیں اپنی حمایت ترک کرنی پڑے تو ترک کر دو۔ لیکن میں اشاعتِ حق سے باز نہیں آ سکتا۔ خواہ یہ لوگ شمس و قمر لا کر میرے ہاتھوں پر کیوں نہ رکھ دیں۔ ایسے رسول سے یہ توقع کرنا بعید از فہم ہے کہ طائف سے واپسی پر مطعم بن عدی سے پناہ مانگی ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابن الدغنہ کو جب معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ بھی حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی غرض سے روانہ ہو گئے ہیں تو وہ پیچھے دوڑا۔ برک الغماد سے اپنی حفاظت و پناہ میں لے آیا۔ کہ تم جیسا شریف انسان مکے سے نہیں جا سکتا۔ صرف ایک شرط رکھی کہ قرآن بلند آواز سے نہ پڑھا کرو۔ کیونکہ اس سے تمام سننے والے متاثر ہوتے ہیں۔ چند دنوں تک اس کی پابندی رہی۔ آخر ذوق و شوق غالب آیا تو تلاوت میں آواز بھی بلند ہونے لگی۔ ابن الدغنہ نے شکوہ کیا تو آپ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اپنی پناہ واپس لے لو۔

حضرت عمرؓ نے جب کعبے کے پاس اعلانِ اسلام کیا تو تمام لوگ مارنے کو دوڑ پڑے اور مار دھاڑ شروع ہو گئی۔ یہ دیکھ کر آپ کے ماموں نے پناہ دینے کا اعلان کیا۔ لوگ ہٹ گئے۔ اس کے چند دنوں بعد حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ مسلمان تو ہر جگہ پٹ رہے ہیں۔ اور میں آرام سے بیٹھا ہوں، یہ کوئی لطف کی زندگی نہیں۔ فوراً جا کر اعلان کر دیا کہ تیری پناہ تجھے مبارک ہو، مجھے نہیں چاہیئے۔

علاوہ ازیں جب قبیلۂ عضل اور قارہ کی درخواست پر حضورؐ نے دس مبلغین کو عاصم بن ثابت کی قیادت میں بھیجا تو رجیع کے مقام پر بنو لحیان کے دو سو آدمیوں نے (جن میں ایک سو تیر انداز تھے) حملہ کر دیا۔ یہ دس آدمی ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ تیر اندازوں نے آواز دی کہ تم اتر آؤ۔ ہم تمہیں پناہ دیں گے۔ تو عاصم نے صاف جواب دیا کہ ہمیں کافروں کی پناہ مطلوب نہیں

غرض اس طرح کی پناہ طلبی اکثر صحابہ سے بھی متوقع نہیں۔ تو حضورؐ سے کیوں ہو؟ بات دراصل یوں ہو سکتی ہے کہ کفار و مشرکین میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جن میں بعض محض اپنی شرافت کی وجہ سے۔ اور بعض اپنی خاندانی حمایت کی وجہ سے از خود پناہ کی پیشکش کیا کرتے تھے۔ ابن الدغنہ ابوبکرؓ کی شرافت سے متاثر تھا۔ اور اس نے خود اپنی طرف سے پناہ کی پیشکش کی۔ عمرؓ کے ماموں نے اپنی خاندانی عصبیت کی وجہ سے آپ کو پناہ دی۔ اب سوچئے کہ وہ کون سا انسان تھا جو حضورؐ کی سیرت سے متاثر نہ تھا؟ اگر کچھ ایسے تھے جن کے اس تاثر کے اظہار پر کفر بہت زیادہ غالب تھا۔ تو ان ہی میں ایسے لوگ بھی تھے جو ابن الدغنہ کی طرح اس تاثر کو عملاً ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ مطعم بن عدی بھی ان ہی لوگوں میں تھا جو کفر کے باوجود اپنے اندر کچھ جوہرِ شرافت بھی رکھتا تھا۔ جب ابنائے ہاشم کے مقاطعے اور محاصرۂ شعبِ ابی طالب کو ختم کرنے کا سوال اٹھا۔ تو سب سے پہلے مطعم ہی تھا جس نے تائید کی تھی۔ پھر یہی مطعم تھا جس نے مقاطعے کے عہد نامے کو اپنے ہاتھوں سے چاک کیا تھا۔ اور یہی مطعم تھا جو چند ہمراہیوں کے ساتھ جا کر ابنائے ہاشم کو گھاٹی سے نکال لایا تھا۔ پس صورتِ حال یقیناً یہی ہوئی ہوگی۔ کہ حضورؐ کی مظلومیت کا حال سن کر مطعم نے از خود پناہ دینے کا اعلان کیا ہو اور حضورؐ نے اس پیشکش کو منظور فرما لیا ہو۔ کسی کی پیشکشِ پناہ کو قبول کر لینا اور بات ہے۔ اور کسی سے پناہ طلب کرنا دوسری بات۔ دونوں میں بڑا فرق ہے اور دونوں کے نتائج میں بڑا بل ہے۔ بظاہر ذرا سا لفظی فرق ہے پناہ قبول کرنے اور پناہ مانگنے میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیان کرنے والے نے اس باریک مگر دور رس فرق کو ابتداءً محسوس نہ کیا۔ اور بات چل پڑی۔

(۲) مواخاتِ علیؓ سنہ … ہجری میں حضورؐ نے کوئی پچاس

مہاجرین کی مواخات اپنے ہی انصار سے کرا دی۔ حضرت علی کی کسی سے مواخات نہیں کرائی گئی۔ تو آپ نے گلہ کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا انت اخی فی الدنیا والاخرۃ۔ تم تو دنیا اور آخرت میں میرے بھائی ہو۔

حضرت علی کے اخو الرسول فی الدنیا والاخرہ ہونے میں شک ہی کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس موقعے پر جب کہ ایک انصار اور ایک مہاجر کی مواخات ہو رہی ہو۔ یہ روایت کچھ چسپاں معلوم نہیں ہوتی۔ یہ مواخات صرف ایک معاشی مسئلہ تھا۔ تاکہ ہر انصار ایک بے سرو سامان مہاجر کی کفالت کا ذمہ دار ہو جائے۔ ان میں کچھ مہاجرین ایسے بھی تھے۔ جن کی کسی انصار سے مواخات نہیں ہوئی تھی خود حضورؐ کی کسی سے مواخات نہیں ہوئی۔ پس اگر حضرت علی کی بھی کسی انصاری سے مواخات نہیں ہوئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حضرت علی کے کفیل تو خود حضورؐ تھے کسی سے مواخات کی ضرورت نہ سمجھی ہوگی۔ لیکن اگر واقعی حضرت علی نے عدم مواخات کا شکوہ کیا ہوگا۔ تو اس مواخات کو انصار میں تلاش کرنا زیادہ انسب ہے۔ حضرت سہل بن حنیف کے تذکرے میں ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان کی مواخات حضرت علی سے ہوئی تھی۔ مہاجر کی مواخات مہاجر سے کچھ قابل غور ہو جاتا ہے۔ اور سہل بن حنیف انصاری سے حضرت علی کی مواخات مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔

(۳) تجارتی قافلے پر چھاپے

غزوۂ بدر کے اسباب بیان کرتے ہوئے سیرت نگار لکھتے ہیں کہ ماہ رمضان ۲ھ میں معلوم ہوا کہ قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا شام سے واپس آرہا ہے۔ جس کی واپسی پر قریش نے مدینے پر حملہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اس قافلے کا سردار ابوسفیان تھا۔ یہاں پہنچ کر بعض سیرت نگار لکھتے ہیں کہ حضورؐ نے اس قافلے کو روکنے کا ارادہ فرمایا اور بعض صحابہ سے اس بارے میں مشورہ کیا۔

در اصل معاملہ یوں ہے کہ عام مسلمانوں کے دل میں تو واقعۃً یہ جذبہ پیدا ہوا تھا۔ لیکن حضورؐ اسے بالکل پسند نہ فرماتے تھے۔ مسلمانوں کے دل میں اس تجارتی قافلے کو لوٹنے کا خیال بالکل فطری تھا اس لئے کہ:۔

(۱) تیرہ سال تک ان ہی کفار قریش کے ہاتھوں مسلمان شدید اذیتیں جھیلتے رہے۔ حتیٰ کہ گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔

(۲) کفار مکہ نے مدینے کے یہود سے مراسلت کر کے مسلمانوں کے خلاف ان کو ابھارا تھا۔

(۳) کرز بن جابر فہری نے دن دہاڑے مدینے کی چراگاہ پر ڈاکہ ڈالا اور بہت سے مویشی چرا لے گیا تھا۔ گویا یہ بتایا گیا تھا کہ مکے سے تین سو میل کے فاصلے پر بھی مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔

(۴) مسلمانوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس قافلے کی واپسی کے بعد قریش مدینہ پر حملہ کریں گے۔

(۵) قافلے میں صرف چالیس آدمی ہیں۔ جن کو ایک ہی حملے میں صاف کیا جا سکتا ہے۔ اور ابوسفیان جو تمام مخالفت کا ہیرو ہے۔ اسی قافلے میں ہے۔ قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا ہے۔ یہی ابوسفیان اور اس کے ساتھی، اسی مال و اسباب کے سہارے کمر کس کے چند دنوں بعد ہمارے خلاف آ پہنچیں گے۔ اس لئے اگر اس کو یہیں ختم کر دیا جائے تو نہ فقط مال و اسباب ہی ہاتھ آئے گا۔ بلکہ جذبۂ انتقام بھی سرد ہوگا۔ اور قریش کے حوصلے بھی پست ہو جائیں گے۔

غرض عام مسلمانوں کے دل میں اس قافلے کو لوٹنے کا اگر کوئی بیجا جذبہ پیدا ہوا ہو تو اس پر کوئی تعجب نہیں لیکن یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ خود حضورؐ بھی یہی جذبہ رکھتے تھے۔ یہ قافلہ رمضان میں آرہا تھا۔ اور اس سے پہلے کرز بن جابر فہری کے چھاپے کے بعد حضورؐ نے مختلف دستے مختلف جگہ روانہ فرمائے تھے۔ مثلاً ماہ صفر میں ودان اور ابواء تک۔ ربیع الاول میں بواط کی طرف۔ ربیع الثانی میں عشیرہ یا ذی العشیرہ، سیف البحر اور ثنیۃ المراۃ کی طرف اور جمادی الاخری میں نخلہ کی طرف۔ فوجی دستے روانہ فرمائے مگر ان میں سے کوئی دستہ بھی مشورے کے بعد نہیں روانہ کیا گیا بلکہ حضورؐ نے مارچ کا حکم دیا۔ اور دستے روانہ ہو گئے پھر سوچئے کہ صرف چالیس آدمیوں کے قافلۂ تجارت کو لوٹنا مقصود ہوتا تو حضورؐ کو مشورے کی کیا ضرورت تھی مسلمان پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ اور خواہش مند تھے۔ ذرا سا اشارہ کافی تھا۔ مگر حضورؐ حکم دینے کی بجائے مشورہ کرنے بیٹھے ہیں۔ اور صرف مشورہ ہی نہیں فرماتے بلکہ مشورے کے بعد طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید کو قافلۂ ابوسفیان کی خبر لانے کو بھیج دیتے ہیں۔ غور کیجئے کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی! ایک سیرت نگار نے بھی اس پر غور نہیں کیا۔

اگر واقعی حضورؐ کی یہ مرضی ہوتی کہ مکے سے شام جانے والے تجارتی قافلوں کو روک کر لوٹ لیا جائے۔ تو ہجرت کے بعد قریش کا ایک قافلہ بھی نہ بچ سکتا تھا۔ اس لئے کہ مکے اور شام والی سڑک مدینے سے کچھ دور نہ تھی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ ۶ھ کے بعد جب ابو بصیر عتبہ بن اسید مکے سے بھاگ کر مدینے آ گئے تو حضورؐ نے معاہدہ حدیبیہ کے مطابق ان کو واپس کر دیا۔ ابو بصیر سمندر کے کنارے ذوالمروہ کے پاس مقام عیص میں جا کر مقیم ہو گئے۔ اور مکے کے دوسرے مسلمان قیدی بھی رفتہ رفتہ بھاگ بھاگ کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ اور ان سب نے قریش کے تجارتی قافلوں کا ایسا ناک میں دم کر دیا کہ قریش مکہ نے معاہدہ حدیبیہ کی اس دفعہ کو ختم کرنے کی درخواست کی جس کی رو سے بھاگے ہوئے مسلمانوں کو مدینہ سے واپس کرنا ضروری تھا۔ اگر مسلمان چاہتے تو اس سے پہلے ہی قریش کے تجارتی حلقوں کا ناطقہ بند کر دیتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی حضورؐ نے کبھی اجازت نہ دی۔ حضورؐ نہ تو یہ مقصد جذبۂ انتقام کی پرورش چاہتے تھے۔ اور نہ لوٹ مار جیسے پست مقصد سے اعلیٰ اسلامی اقدار کو مجروح کرنا پسند فرماتے تھے۔ اس وقت حضورؐ کے سامنے دو چیزیں تھیں۔

ایک طرف مسلمانوں کی مارشل اسپرٹ تھی جسے آگے چل کر اعلیٰ اقدار کی محافظت کے لئے وقف ہونا تھا۔ اس اسپرٹ کو دبا کر ختم کرنا کسی صاحب عقل کے نزدیک درست نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس دباؤ سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو کر کوئی نامناسب ردعمل پیدا ہوتا۔

دوسری طرف یہ خطرہ تھا کہ اگر ان مسلمانوں کو مارچ کا حکم دے دیا جائے تو یہ کوئی اعلیٰ مقصد نہ ہوگا۔ محض جذبۂ انتقام ہوگا۔ نیز اسلامی اقدار جنگ کے بھی خلاف ہوگا۔ یعنی دشمن حملہ آور نہیں ہوتا۔ مٹھی بھر بے طاقت جماعت ہے اور وہ بھی قافلۂ تجارت کی شکل میں۔ یہ کوئی شجاعت نہیں کہ کسی کو کمزور پا کر دبا دیا جائے۔ اور وہ بھی کسی اعلیٰ مقصد کے لئے نہیں۔ بلکہ محض لوٹ مار کے لئے۔

غرض فوجی جذبے مارشل اسپرٹ کو دبا کر جذبات کو مجروح کرنا اور مارچ کا حکم یا اجازت دینا، دونوں نامناسب تھے۔ اس لئے حضورؐ نے ایک ایسی راہ اختیار فرمائی کہ یہ حملہ بھی نہ ہو اور مسلمانوں کے جذبات بھی مجروح نہ ہوں۔ یعنی مارشل اسپرٹ کو آئندہ کے لئے محفوظ رکھا جائے۔ اور اس قافلۂ تجارت سے مڈبھیڑ ہونے کا وقت ٹال دیا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنی عدیم النظیر بصیرت سے یہی کچھ کیا۔ وہ اس طرح کہ کچھ وقت مشورے میں صرف کیا۔ جب یہ معلوم کر لیا کہ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے جذبات حملے کے حق میں ہیں تو کچھ مزید وقت اس لئے لے لیا کہ مزید حالات معلوم کر لئے جائیں۔ پھر دو شخصوں (طلحہ بن عبید اور سعید بن زید) کو خبر لانے کے لئے بھیجا۔ اس جنگ کو ٹالنے کی یہ بڑی اعلیٰ درجے کی حکیمانہ تدبیر تھی۔ چنانچہ اسی مشورے اور تگ و دو میں ابوسفیان کو اتنا موقع مل گیا کہ وہ دریا کنارے کا راستہ اختیار کر کے صاف بچ نکلا۔ یہی مقصد تھا جسے حضورؐ نے ایسی خوبصورتی سے پورا فرمایا کہ مسلمانوں کو ایک پست مقصد یعنی تسکین انتقام اور غیر شجاعانہ جنگ اور لوٹ مار سے بھی بچا لیا۔ اور قوت قتال کو ایک دوسرے اہم موقعہ ــــ بدر ــــ کے لئے محفوظ بھی کر لیا۔

ہمیں قرآن پاک سے بھی کچھ اسی قسم کا اشارہ ملتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمتہ ویقطع دابر الکفرین (۸: ۷)

"اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ تم سے ان دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمہارے لئے مقدر ہے۔ اور تم یہ چاہتے تھے کہ کمزور ہی جماعت تمہارے لئے ہو۔ حالانکہ اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے فرمان سے حق کو حق ثابت کر کے ان کی جڑیں کاٹ دے۔ ...... الخ"

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک پر مسلمانوں کو قابو حاصل ہوگا۔ ایک طاقتور گروہ تھا۔ اور دوسرا کمزور ــــ اس کی تفسیر

اب تک یہی کی جاتی ہے کہ ایک معرکہ بدر تھا۔ اور دوسرا یہ تجارتی قافلہ۔ اور اس تفسیر کے علاوہ کوئی دوسری تفسیر ہمارے سامنے نہیں آئی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کی فطری خواہش یہی تھی کہ کمزور گروہ (قافلۂ تجارت) ہی ان کے قبضے میں آ جائے۔ کیونکہ مقابلہ بھی آسان تھا۔ اور مال غنیمت کی فراوانی بھی تھی۔ لیکن اللہ کی ــ اور اللہ کے رسول کی بھی ــــ خواہش یہ تھی کہ قافلۂ تجارت کی بجائے اس گروہ سے مقابلہ ہو (یعنی محاربین بدر کا) جس کے بعد باطل و کفر کا زور ٹوٹ جائے۔ یہ کہنا کہ رسول اللہ کی بھی وہی خواہش تھی، جو عام مسلمانوں کی تھی۔ یا خود رسول اللہؐ ہی نے مسلمانوں کو قافلۂ تجارت لوٹنے پر ابھارا تھا۔ ہمارے خیال میں روح قرآنی، سیرت رسول اور مقاصد اسلامیہ کے مطابق نہیں ہے۔

(۴) شکم پر پتھر باندھنا — غزوہ احزاب یعنی غزوہ خندق (ذوالقعدہ ۵ھ) کے بیان میں عموماً سیرت نگار یہ ذکر کرتے ہیں کہ بعض صحابہ نے حضورؐ کو اپنے پیٹ پر ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا تو حضورؐ نے دو پتھر اپنے شکم مبارک پر بندھے ہوئے دکھا دیئے۔ سیرت پاک میں جہاں تک مجھے یاد ہے ایک آدھ موقع پر بھی پتھر باندھنے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں قابل صرف یہ باتیں ہیں کہ

(۱) بھوک میں شکم پر پتھر باندھنے کا رواج کیا پہلے بھی کہیں تھا، یا بعد میں کہیں اس کا دستور رہا ہے۔ یا آج کہیں اس پر عمل ہوتا ہے؟ بھوک کی شکایت کچھ غزوہ خندق ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ مکی و مدنی دونوں زندگیوں میں مسلمان بھوک کے شکار تھے۔ اور بعض کے لئے بیٹھ کر اٹھنا دشوار ہو جاتا تھا۔

ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں ایک زمانہ میں راہ چلتوں سے مسائل دریافت کیا کرتا تھا کہ شاید اسی بہانے کوئی میری حالت زار دیکھ کر کھانے کو پوچھ لے۔ لیکن کہیں بھی پتھر وغیرہ باندھنے کا ذکر نہیں آیا۔

(۲) کیا پیٹ پر پتھر باندھنے سے واقعی بھوک کو کوئی تسکین ہوتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو غزوہ خندق کے بعد سے اب تک کون کون بھوکا اس پر عمل کرتا رہا؟

(۳) اگر تسکین فاقہ اس سے مقصد نہیں تو اس کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

(۴) کیا اظہار فاقہ کشی کی یہی ایک شکل ہے کہ کپڑا ہٹا کر پیٹ پر پتھر بندھا ہوا دکھایا جائے؟ کیا زبانی کہہ دینے سے یا چہرے بشرے یا آواز سے اس کا پتہ نہیں چل سکتا۔ نقص (؟) شہر (؟) ایسا (؟) ... (؟)

(۵) کیا روزے دار فاقے سے نڈھال ہو کر شکم پر پتھر باندھا کرتے ہیں۔

(۶) پیٹ پر پتھر باندھنا کوئی محاورہ تو نہیں؟ ہم تیرہ صدیوں کے مسلمات کو علط نہ کہیں جب بھی یہ مسئلہ قابل غور تو ضرور ہے۔

(۵) تہائی پیداوار پر صلح — اسی غزوہ خندق کے سلسلہ میں سیرت نگار لکھتے ہیں کہ ایک ماہ کے مسلسل محاصرے سے جب مسلمان پریشان ہو گئے

ہماری چند مطبوعات

["اسلام نے انسانیت کے لئے ربانی پیغام کی تکمیل کی۔ اور اسی لئے اسلام کے ساتھ ہی تاریخ کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے: ہماری اسلامی کتابیں اسی حقیقت کی تفصیل و تشریح ہیں۔]

قرآنی تعلیمات

قرآن اس کائنات میں خدا کے سوا ہر عالم کے لئے پیغام مرگ ہے۔
ع چیست قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ
قرآن حیات و موت کے اسرار کھولتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ انسانی تمدن میں ہمواری پیدا کرتا ہے۔ مولوی سلیم عبداللہ نے بڑے آسان اور ذہن نشین انداز میں کتاب اللہ کی انقلابی تعلیمات اس کتاب میں پیش کی ہیں۔ قیمت :۔ ایک روپیہ بارہ آنے

رسول پاک

کون تھے؟ کیسے تھے؟ اور آپ نے کیا سکھایا؟
یہی وہ باتیں ہیں جو ہمیں اپنے بچوں اور مستقبل کے نقش گروں کو سکھانی ہیں۔ مولانا عبدالواحد سندھی نے بچوں اور کم پڑھے لکھے حضرات کے لئے یہ کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا بہت اچھا تعارف ہے۔ ہر سطر خلوص دردمندی اور سادگی کی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ قیمت :۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

اسلامی تقاریب

اسلامی تقاریب، اسلام کی روح اور شعائر سے ہم آہنگ ہیں۔ یہ کتاب اسی موضوع پر یادگار مضامین کا مجموعہ ہے جسے مولوی غلام دستگیر نے مرتب کیا۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین، اور دوسرے اکابرین کے مقالات شامل ہیں۔ قیمت :۔ چار روپے

قرآن پاک کیا ہے؟

اور اس نے کیا کر دکھایا
مولوی عبداللہ سندھی نے انسانی تاریخ پر قرآن حکیم کے انقلابی اثرات کو بڑی سلیس اور صاف زبان میں پیش کیا ہے۔ تاکہ عام آدمی بھی بغیر دشواری و زحمت اپنے آپ کو رخ قرآن سے قریب کر سکے۔
قیمت :۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

فکر اقبال

مرتبہ :۔ غلام دستگیر
اقبال کی شخصیت مجمع البحرین تھی۔ لیکن اس عظیم شخصیت کا سب سے روشن اور تابناک پہلو اس کی بصیرت قرآنی ہے۔ اسی بصیرت نے اسے بتایا کہ اسلام تقدیر کائنات ہے۔
فکر اقبال ایک ایسی کتاب ہے جو اقبال کے افکار کی دنیا تک آپ کی رہنمائی کرے گی اس میں برصغیر کے ممتاز ترین اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔
قیمت :۔ ساڑھے چار روپے

اردو اکیڈمی سندھ
رحمت بلڈنگ۔ مولوی مسافر خانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی

اردو مرکز
گنپت روڈ ۔ لاہور

تو حضورؐ کو انصار کی بد دلی کا خیال پیدا ہوا۔ حضورؐ نے تجویز فرمایا کہ مدینے کی ایک تہائی پیداوار ادا کرنے کی شرط پر بنی غطفان سے صلح کر لی جائے۔ تاکہ دشمنوں کا ایک بڑا قبیلہ جنگ سے الگ ہو جائے۔ اس پر سرگروہ انصار سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ نے کہا کہ ہم نے حالتِ کفر میں کسی کو خراج نہیں دیا۔ تو اب حالتِ اسلام میں کون ہم سے خراج وصول کر سکتا ہے!۔

یہ واقعہ کچھ اس انداز سے لکھا جاتا ہے کہ انصار تو ماشاء اللہ بلند ہمت تھے مگر حضورؐ میں نعوذ باللہ کچھ پست ہمتی آگئی تھی۔ اس لئے کافروں کے ایک گروہ کو خراج دے کر مصالحت کر لینے کی "خواہش یا تجویز" پیش فرمائی۔ آیئے ہم پہلے اسے قرآنی معیار پر پرکھ کر دیکھیں۔ قرآن پاک میں غزوۂ احزاب کے تین گروہوں کا وضاحت سے ذکر ملتا ہے۔

(۱) پختہ کردار والوں کے متعلق یوں ہے:۔

ولما راء المومنون الاحزاب قالوا ھذا ماوعدنا اللہ ورسولہ وما زادھم الا ایماناً وتسلیماً (۳۳-۲۲)

جب اہل ایمان نے کفار کے لشکروں کو دیکھا تو بول اٹھے کہ یہی تو وہ بات ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ فرمایا ہے۔ اور اس سے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا میں اور اضافہ ہی ہو گیا

(۲) ذرا نیچے درجے کے اہل ایمان کے متعلق یوں ہے:۔

واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا ہنالک ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالا شدیدا (۳۳: ۱۰، ۱۱)

اور جب نگاہوں میں کجی آگئی اور کلیجے منہ کو آنے لگے تو تم کو اللہ کے متعلق بھی سو سو طرح کے ظن پیدا ہونے لگے۔ اس موقعہ پر اہل ایمان کی آزمائش ہوئی اور ان میں شدید قسم کا تزلزل پیدا ہو گیا:

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ان ہی مومنین کے متعلق کہا گیا ہو جن کی ابتدائی حالت وہ تھی جو اوپر والی آیت میں بیان کی گئی ہے۔ اور ان ہی کی یہ حالت بعد میں بتقاضائے بشریت ہو گئی ہوگی۔

(۳) تیسری جماعت منافقین کی ہے۔ جن کا ذکر یوں ہے۔

واذ یقول المنفقون والذین فی قلوبہم مرض ماوعدنا اللہ ورسولہ الا غرورا (۳۳-۱۲)

اور جب منافق اور قلبی امراض رکھنے والے یہ کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدہ کیا ہے۔ وہ محض دھوکا ہے۔

ایک شدید قسم کے امتحان پر بڑے سے بڑے مومن کا ہل جانا تو سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن اول المومنین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی کمزوریاں منسوب کرنے کی ہمت ہم اپنے آپ میں نہیں پاتے۔ اسی سورۂ احزاب میں منافقوں کا ذکر کرتے ہی یہ آیت موجود ہے کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ الخ (۳۳: ۲۱)

تمہارے لئے رسول کی زندگی میں حسین نمونہ موجود ہے"

اگر زیر بحث روایت صحیح ہے تو اس کی اصلیت صرف اتنی ہوگی کہ حضورؐ نے یہ "تجویز یا خواہش" پیش نہیں فرمائی تھی۔ بلکہ محض امتحاناً یہ دریافت کیا ہوگا۔ تاکہ اگر انصار میں کوئی کمزوری نظر آئے تو ان کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کسی اور طریقے سے کی جائے۔ سیرت نگاروں کا جو انداز بیان ہے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور بجائے اس کے کہ کمزور دلوں کی ہمت بندھاتے اور الٹا خود ہی نعوذ باللہ ہمت ہار گئے۔ اور وہ بھی اس حد تک کہ کافروں کے ایک گروہ کو مسلمانوں سے خراج دلوانے کی تجویز پیش فرما دی!

حضورؐ نے کفر کے ساتھ اس قسم کی مصالحانہ مداہنت (COMPROMISE) کبھی گوارا نہیں کی۔ جس سے کسی فرد ملت کی اسلامی خودداری مجروح ہو جائے کہ ......

ملت کی یا اپنی روشِ خودی متاثر ہو۔ ودوا لو تدھن فیدھنون (لوگ چاہتے تھے کہ آپ کچھ ڈھیل دیں تو وہ بھی نرم پڑ جائیں۔) لولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیہم شیئاً قلیلا اذا لاذقناک ضعف الحیوۃ وضعف الممات ثم لا تجد لک علینا نصیرا (اگر ہم نے (اے رسول) تم کو ثابت قدم اور اٹل نہ رکھا ہوتا۔ تو تم تھوڑے بہت کچھ ان کی طرف مائل ہونے کے قریب ہو جاتے (لیکن اگر ایسا ہوا ہوتا) تو ہم تمہیں زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی یقیناً دوگنی سزا کا مزہ چکھاتے پھر تمہیں ہمارے مقابلہ میں کوئی حامی و ناصر تک نہ ملتا!)

اس سے زیادہ صاف، واضح اور طاقتور دلیل حضورؐ کے اٹل و (UNCOMPROM)SING عزم و کردار اور غیر متزلزل یقین و عمل کی اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ قرآن کی آیت ہے۔

حضورؐ کا کسی موقعہ پر اپنی طرف سے رعایتیں یا انعامات دینا تو سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ یہ رحمۃ اللعالمینی اور تالیف قلوب کے تقاضے ہیں لیکن گھبرا کر یا ڈر کر کسی دباؤ کو قبول کرنا یا ادائے خراج پر مجبوراً راضی ہو جانا یہ تو حضورؐ کی پوری سیرت میں ایک بڑا خلاء پیدا کر دیتا ہے جو قابل قبول نہیں۔

(۲) بُدیل بن ورقاء اور سفارت قریش

تمام سیرت نگاروں نے اسے تسلیم کیا ہے کہ بنو خزاعہ کا قبیلہ مسلمانوں کا حلیف تھا۔ اور بعد میں بھی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر ان کے ایک فرد بدیل بن ورقاء نے حضورؐ کی طرف سے پیام رسانی بھی کی معاہدہ حدیبیہ کے بعد قریش نے بنو بکر سے اور مسلمانوں نے بنو خزاعہ سے معاہدہ کر لیا۔ "بکریوں" اور "خزاعیوں" میں قدیم عداوت چلی آتی تھی۔ جو عارضی طور پر اس لئے دب گئی تھی کہ قریش اور بنو بکر دونوں کی دشمنی کا رخ مسلمانوں کی طرف زیادہ تھا۔ جب یہ بکری قبیلہ قریشیوں اور خزاعی قبیلہ مسلمانوں کا حلیف ہو گیا تو بکریوں اور خزاعیوں کا باہمی عناد تازہ ہو گیا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ بکریوں نے قریش کی مدد سے حرم میں بڑی بے دردی سے خزاعیوں کا خون بہایا۔ چالیس خزاعی جن میں بدیل بن ورقاء بھی تھے۔ بچ کر نکل گئے۔ اور فریادی اشعار پڑھتے ہوئے مدینہ میں داخل ہوئے۔ یہی واقعہ ہے جو آگے چل کر مکے کی طرف مسلمانوں کے کوچ کا سبب بنا۔

یہاں تک سب ہی سیرت نگار متفق ہیں۔ لیکن آگے چل کر بتاتے ہیں کہ .....

حضورؐ کے ساتھ دس ہزار آدمیوں نے (جن میں بنو خزاعہ بھی تھے) جب مرالظہران سے ایک منزل دور پڑاؤ کیا تو اس کی بھنک پا کر قریش نے اپنے تین سفیر و مخبر حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) ابو سفیان اور بدیل بن ورقاء کو اسلامی عساکر کی دریافت حال کے لئے بھیجا۔ یہاں قابل غور صرف اتنی سی بات ہے کہ بدیل بن ورقاء قریش کے جاسوس یا سفیر و مخبر بن کر ابو سفیان اور حکیم بن حزام کے ساتھ کیونکر آ سکتے تھے۔ جبکہ ا

(۱) اس وقت ان کا قبیلہ بنو خزاعہ خود مسلمانوں

بی پی
ڈبل وی
جسم کو
توانائی
بخشتی
ہے

کے ساتھ مر الظہران میں موجود تھا، اور پہلے ہی سے حلیف بھی تھا۔

(۲) بنو خزاعہ کو قریش اور بنو بکر نے مل کر بری طرح مارا تھا۔ جس کی فریاد لے کر چالیس بقیۃ السیف جن میں خود بدیل بن ورقا بھی تھے مدینے آئے۔ اور یہی واقعہ مکے کی طرف چل پڑنے کا سبب بنا۔

(۳) بدیل اور ان کے خزاعی قبیلے کا زخم تازہ تھا جو ابھی تک مندمل نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ نہ تو ان کا خون بہا قریش اور بنو بکر نے ادا کیا تھا۔ نہ کوئی مصالحت ہوئی تھی۔

(۴) خزاعیوں کے رئیس۔ بدیل مسلمانوں کے حلیف تھے۔ اور بذاتِ خود بھی مسلمانوں کے ہمدرد تھے۔ اور بموقع حدیبیہ مسلمانوں ہی کی طرف سے پیغام لے کر قریش کے پاس آتے جاتے رہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ بدیل مدینہ آ گئے تھے۔

ان تمام حقائق کے باوجود دفعتہً وہ قریش کے سفیر و مخبر کس طرح بن گئے؟ یہ ذرا سوچنے کی بات ہے۔

(۷) کعب بن اشرف اور ابو رافع کا قتل

سیرت نگار بڑی بے تکلفی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ کعب بن اشرف یہودی کو قتل کرنے کے لئے محمد بن مسلمہ۔ عباد بن بشر۔ حارث بن اوث۔ ابو عبس بن جبر اور ابو نائلہ سلکان بن سلامہ، حضورؐ کی مرضی سے روانہ ہوئے اور ایک خاص دھوکہ سے کعب بن اشرف کو اس کے گھر جا کر قتل کر دیا۔ اور حضورؐ اس سے خوش ہوئے یہ انصاری قاتلین بنی اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا بنی خزرج کو بھی ایسی ہی "نیکی" کرنے کا شوق پیدا ہوا اور عبداللہ بن عتیک۔ عبداللہ بن انیس۔ ابو قتادہ حارث بن ربعی مسعود بن سنان اور خزاعی بن اسود نے حضورؐ کی مرضی سے ابو رافع یہودی کو شب کی تاریکی میں مکان کے اندر قتل کر دیا۔ اور حضورؐ نے اسے بھی پسند فرمایا۔ ان دونوں روایتوں میں یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے قتل کعب کے لئے دھوکے سے کام لینے کی خود ہدایت فرمائی۔ اور اس وفد کو بقیع الغرقد تک رخصت فرمانے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور قتل ابو رافع کے لئے عبداللہ بن عتیک کو امیر مقرر فرمایا۔ نیز قتل کعب کے بعد حارث بن اوس کو جو زخم لگا تھا۔ اسے حضورؐ نے لعابِ دہن لگا کر اچھا کر دیا۔ اور قتل ابو رافع کے سلسلہ میں عبداللہ بن عتیک کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ حضورؐ نے اسے بھی ہاتھ پھیر کر اچھا کر دیا۔ کیونکہ حضورؐ دھوکے کے اس قتل سے ہر طرح راضی تھے۔

اس وقت ہم ان تمام اسلامی قوانین قتال و قتل اور اخلاقی اقدار کا ذکر نہیں کریں گے۔ جن کو ایک ایک قدم پر حضورؐ نے خود بھی ملحوظ رکھا۔ اور سب کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ہم صرف اتنا ہی عرض کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ بغیر حالت حرب کسی کے مکان پر جا کر دھوکہ سے قتل کرنے کی اجازت اسلام میں نہیں ہے۔ اور نہ رسول اللہ کی اعلیٰ ترین سیرت سے اسے کوئی تطابق حاصل ہے محمد رسول اللہ کی طرف اس کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابو براء کلابی کی درخواست پر حضورؐ نے ستر قراء و فضلا کو تبلیغ کلاب میں دین پھیلانے کے لئے بھیجا۔ بیر معونہ پر پہونچ کر یہ سب کے سب دھوکے سے قتل کر دیئے گئے دو آدمی بچ گئے۔ جن میں سے ایک عمرو بن امیہ نے باغ میں پناہ لیتے ہوئے بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا یہ دھوکے کا جواب تھا۔ لیکن حضورؐ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کرنے کا حکم دیا۔ ہمارے سیرت نگار اس واقعے کو بھی لکھتے ہیں۔ اور کعب و ابو رافع کے قتل کے واقعے کو بھی۔ لیکن ذرا سوچئے کہ ان دونوں کے اخلاقی اقدار میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ ان دونوں واقعات کے محلِ نظر ہونے پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے ہم اس وقت زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔

یہ "مشتے نمونہ از خروارے" قوم کے لئے غور و فکر کے لئے ہے۔ اگر قوم نے دلچسپی لی تو ممکن ہے کچھ "اندکے از بسیارے" اور بھی پیش کیا جائے۔ سچ پوچھئے تو پوری اسلامی تاریخ — نیز فقہ، احادیث، تصوف اور لغت — سب پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے
پرانے پرچے

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں اُن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست۔ ستمبر۔ نومبر۔ دسمبر
۱۹۵۱ء	جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری و اکتوبر کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزمہائے طلوعِ اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے۔ خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

سوئیں نناوّے

اشخاص ریاح یا سوری تجزیہ معدہ (معدہ میں گیس پیدا ہونا) کے مریض ہیں۔ پاخانہ صاف نہ ہونا، تمام جسم میں درد، سر میں چکر، بھوک غائب، ہاضمہ خراب، طبیعت میں بےچینی۔ سینے میں جلن۔ خون میں کمی اور نزلہ رہنا، اس مرض کی عام شکایات ہیں۔ اس مرض کا حب باسوری اور جوہرِ ہضم (مکمل کورس)، سے زیادہ زود اثر کوئی دوسرا علاج نہیں یہ تمام شکایات کو دور کر کے تندرستی قوت اور توانائی بخشتا ہے۔ قیمت مکمل کورس دس روپے آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک۔ مفت کے لئے دہلی ہمدرد مسند کراچی۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ بھیج کر خریدار بنئے

دردمند دواخانہ۔ فریر روڈ۔ کراچی ۲ فون نمبر ۳۵۴۲۱

ہنسا چھالیا

دو ٹکڑے — صاف خشک — پُرانے

(پیکٹوں میں خریدیئے)

تیار کردہ:- محمد اصغر محمد یونس چھالیا والے — جونا مارکیٹ — کراچی نمبر ۲

حضرت رسالت مآب صلعم کی تعلیم اور سیرت کا معاملاتی پہلو

(از:۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی)

ہر انسان کی شخصیت کے دو بڑے پہلو ہوتے ہیں۔ ایک روحانی (جس میں اخلاقی پہلو بھی شامل ہے) اور دوسرے جسمانی (جو ذہنی پہلو پر بھی مشتمل ہے) شخصیت کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے۔ جب یہ دونوں پہلو ایک ساتھ متوازن طور پر نشو و نما پائیں۔ اور ہر ایک پوری طرح عمل کرے۔ اگر ایک پہلو بھی ناقص رہ جائے تو پھر اس انسان کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ اور معاشرہ کو اس کی ذات سے کما حقہٗ فائدہ نہیں پہنچتا۔ روحانی اور جسمانی پہلو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور آزاد نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس شخص کا جسم اور ذہن جامد ہو کر رہ جائے اور پوری طرح نشو و نما نہ پائیں۔ اس کی روحانی اور نفسیاتی کیفیت ویسی آب دار نہیں ہو سکتی۔ جیسی ایک تندرست اور صحیح العقل شخص کی ہوتی ہے۔ اسی طرح جس شخص کی روحانی ترقی رک جائے۔ وہ اپنے جسم اور قوائے ذہنی سے صحیح طور پر کام نہیں لے سکتا۔ اس جہان فانی کی حد تک انسانی زندگی میں روح اور جسم کی ایک ساتھ نشو و نما لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

دین اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس نے شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کی نشو و نما پر زور دیا ہے۔ دوسرے مذاہب میں جسم کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب کے پیرووں کو جب دنیاوی ترقی کا خیال ہوا تو وہ مجبور ہو گئے کہ مذہب کو شخصی اور خانگی حیثیت دے کر پس پشت ڈال دیں۔ اور سیاسی اور دنیاوی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل دینے کی اجازت نہ دیں۔ اس کے برخلاف اسلام نے ایسی کوئی تفریق روا نہیں رکھی اور معاملات کو بھی دین کا جزو اسی طرح قرار دیا۔ جس طرح عبادت کو اسلامی تعلیم میں حقوق العباد کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی حقوق اللہ کی۔ بلکہ اول الذکر کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ حق تعالیٰ غفور الرحیم ہیں اور اپنے حقوق بھی معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن بندوں کے حقوق کے معاملہ میں وہ دخل انداز نہیں ہوتے۔ ایک بندے کا حق جو دوسرے پر ہو کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔

اسلام میں علم الاخلاق کی بنیاد اسی حقوق العباد کے اصول پر ہے۔ چونکہ اس کا تعلق انسانی معاشرہ سے ہے جو طبیعی کائنات کا ایک جزو ہے۔ اس لئے وہی قانون مکافات یعنی عمل اور رد عمل پایا جاتا ہے۔ جو طبیعی کائنات میں جاری و ساری ہے۔ کسی شخص کے ہر اس عمل کی جو دوسرے بندوں پر اثر انداز ہو جزا یا سزا ناگزیر ہے۔ بلحاظ اس کے کہ وہ عمل خیر ہے۔ یا شر۔ معاشرہ میں کسی شخص کا کوئی عمل نہ تو بے اثر ہوتا ہے۔ نہ قابل تلافی۔ کیونکہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اس کو واپس نہیں لیا جا سکتا۔ علم طبیعیات میں ایسے عمل کو (IRREVERSIBLE PROCESS) کہتے ہیں۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے حضرت رسالت مآب صلعم کی تعلیم اور سیرت مبارک کے معاملاتی پہلو پر کافی توجہ نہیں کی اور عبادت و توبہ کا غلط مفہوم لیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ اگر انسان کلمہ پڑھے، دن میں پانچ وقت نماز ادا کرے۔ رمضان کے مہینے میں روزے رکھ لے۔ سالانہ زکوٰۃ نکال دے اور عمر بھر میں ایک حج کرلے تو پھر اس پر کوئی اور ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔ اس کی نجات یقینی ہے۔ اور جنت اس کے لئے مقسوم ہو چکی ہے۔ اس کے بعد چاہے وہ معاملہ کا کتنا ہی کھوٹا کیوں نہ ہو۔ لوگوں کے حقوق کی پامالی میں کوتاہی کیوں نہ ہو۔ تجارت اور کاروبار میں بددیانتی کا مرتکب کیوں نہ ہو۔ اس کی عبادتیں آڑے آئیں گی۔ اور اس کو دوزخ کی آگ سے بچا لیں گی۔ کسی نے اگر حقوق العباد کی کچھ اہمیت سمجھی بھی تو یہ کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ مرتے دم توبہ کر لیں گے اور سارے گناہوں سے ایسے پاک ہو جائیں گے۔ جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوا نوزائیدہ بچہ۔ گویا بزعم خویش وہ قانون قدرت کو توڑ سکتے ہیں۔ اور (IRREVERSIBLE) افعال کو (REVERSIBLE) بنا سکتے ہیں۔ عبادت اور توبہ کے اس غلط تصور نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے کہ نہ صرف جدید تعلیم یافتہ مسلمان بلکہ غیر اقوام کے لوگ بھی جب کبھی کسی مذہبی اور مقدس شکل کے مسلمان کو دیکھتے ہیں تو فوراً اس کی اخلاقی پستی اور بد معاملگی پر یقین کر لیتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ صرف مذہب سے بیگانہ طبقہ ہی دیندار اشخاص کے متعلق ایسا خیال رکھتا ہے۔ بلکہ علامہ حالی جیسے اہل دل کا بھی یہی تاثر تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

غضب خدا کا۔ جس ذات قدس صفات نے بنی آدم کو جہالت اور گمراہی کے تحت الثریٰ سے نکال کر علم و عرفان اور کمال شخصیت کے عرش معلیٰ پر پہنچنے کا راستہ بتایا ہو۔ اس کے پیرووں کے متعلق دنیا کا یہ خیال ہو کہ ان میں جو شخص جتنا زیادہ مذہب کا پابند نظر آئے وہ اسی قدر زیادہ پست سیرت انسان ہوگا

اس جانکاہ سانحہ پر قلب اور زبان بے اختیار چیخ اٹھتے ہیں

یا محمد در قیامت گر برآری سر زخاک
سر برآور وایں قیامت در میان خلق بیں

پھر یہ حالت کسی خاص خطۂ زمین تک محدود نہیں ہے۔ جس کسی نے بھی اسلامی ممالک کا سفر کیا ہے۔ وہ اگر دیانت داری کے ساتھ اعتراف کرے اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرے تو شہادت دے سکتا ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلمان بستے ہیں سیاسی اور مادی انحطاط کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی پستی بھی ضرب المثل بن چکی ہے ممکن ہے بعض گوشوں سے یہ آواز آئے کہ اور دوسری قوموں کی اخلاقی حالت بھی تو کچھ نصب العینی نہیں ہے۔ پھر مسلمانوں ہی کو کیوں مورد عتاب کیا جا رہا ہے۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ ہم کو سب سے پہلے اپنی حالت کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ دوسرے لوگ اپنی فکر آپ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سوال شدت کا ہے۔ دوسروں کی حالت اتنی خراب نہیں ہے۔ جتنی ہماری حالت ابتر ہے۔ پھر ان قوموں کے متعلق "کنتم خیر امت" نہیں کہا گیا ہے۔ ان کے پیغمبر خاتم النبیین نہیں تھے۔ ان کے مذاہب کے متعلق خداوند کریم نے "الیوم اکملت لکم دینکم" نہیں فرمایا ہے۔ ان کی عبادتوں کی بابت یہ دعویٰ نہیں کیا گیا ہے کہ وہ "فحشا اور منکر سے باز رکھتی ہیں"۔

مسلمانوں کے متعلق یہ امر قابل غور ہے کہ وہ اسلام کے معتقد ہونے کے باوجود قعر ذلت میں کیوں پڑے ہوئے ہیں کیا نعوذ باللہ قرآن کا یہ وعدہ غلط ہے کہ "اگر تم مومن ہو تو سب سے زیادہ بلند و برتر رہو گے"۔ اذا فات الشرط فات المشروط اگر صغریٰ ہی غلط ہو تو کبریٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی پستی اگر ایک امر واقعہ ہے تو قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت کی رو سے اس کا لازمی سبب یہ ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں مومن نہیں ہیں۔ اسلام کے ارکان خمسہ پر ایمان رکھنے اور ان فرائض کے بجا لانے کے بعد بھی وہ سچے مسلم نہیں کہلائے جا سکتے۔ اس لئے کہ ان کی سیرت میں معاملات کا پہلو ناقابل بیان حد تک تاریک ہے۔

روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں ایک بدوی حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا کہ میں ابھی حال ہی میں مسلمان ہوا ہوں۔ لیکن مجھ سے یہ نماز روزہ وغیرہ اتنے بہت سے جھگڑے نہیں ہو سکتے۔ مجھے صرف ایک بات بتایئے جس پر میں عمل کر سکوں۔ آپ نے فرمایا اچھا تم جھوٹ نہ بولو۔ کہتے ہیں کہ اس نے جھوٹ نہ بولنے کا اقرار کیا اور رفتہ رفتہ اسی ایک بات کی بدولت وہ صالح اور پاکباز مسلمان بن گیا کیونکہ جب کبھی وہ کسی برے کام کا قصد کرتا۔ تو معاً اسے خیال آ جاتا کہ لوگ پوچھیں گے تو سچ کہنا پڑے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلعم کی فطرت شناس نظروں میں حسن سیرت اور عمل صالح کی کس قدر اہمیت تھی۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ارکان خمسہ گویا رکنیت کے چندہ کے مماثل ہیں، جس کو ادا کرنے کے بعد کوئی شخص مسلم سوسائٹی کا ممبر بن جاتا ہے۔ لیکن جس طرح چندہ ادا کرنے کی بنا پر

کوئی فرد کسی سوسائٹی کا مفید یا کارکن ممبر نہیں کہلایا جاتا بلکہ اس کے لئے سوسائٹی کے اعلیٰ اغراض و مقاصد اور پروگرام پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح محض کلمہ پڑھنے یا نماز روزہ کی ادائیگی سے انسان اسلامی معاشرے میں داخل تو ہو جاتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں مرد مومن نہیں بن سکتا جب تک اس کی سیرت اور کردار اس قسم کا نہ ہو جو اسلامی معاشرے کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ اسلامی سیرت وکردار وہی ہے جس کے متعلق قرآن حکیم میں کہا گیا ہے

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

اگر ہماری جماعت کے افراد حقیقی معنوں میں مسلمان ہونا چاہیں۔ اور صحیح قسم کے اسلامی معاشرے کی تکمیل کا خیال ہو تو اس کے لئے اسوہ حسنہ کا اتباع لازمی ہے

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

تاریخ شاہد ہے کہ حضور صلعم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں کوئی معجزات پیش نہیں کئے یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ کوئی شخص باہر والوں کی نظر میں ہیرو ہو تو ہو۔ لیکن اس کے اپنے گھر والے جو اس کو نہایت قریب اور ہر لحظہ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے دیکھتے ہیں۔ مشکل ہی سے اس کو ہیرو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم کی رسالت پر سب سے پہلے ان کے اپنے گھر والے اور قریبی دوست ایمان لائے۔ اسکی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں کو آپ کی صداقت، خلوص اور دیانت داری پر اتنا اطمینان تھا کہ جب آپ نے رسالت کا دعویٰ کیا تو ان کے وہم وگمان بھی نہیں آسکتا تھا کہ یہ دعوی صحت و صداقت پر مبنی نہیں ہے۔

بعثت سے قبل بھی آپ کا کردار ہر قسم کی آلائش سے پاک تھا۔ کسی کے سہارے زندگی گذارنے کی بجائے آپ نے سنت و مشقت کو ترجیح دی۔ اور تجارت کو ذریعہ معاش بنایا لین دین اور معاملہ کے آپ اتنے کھرے تھے کہ آپ کی دیانت اور راست بازی زبان زد خاص و عام ہو گئی تھی اور قوم نے آپ کو امین کا لقب عطا کیا تھا۔ لوگ خواہش رکھتے تھے کہ آپ ان کی طرف سے تجارت کریں۔ اس پیشہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے آپ کو غیر مقامات کی سیاحت اور دنیا کے حالات سے واقفیت کا موقعہ ملا۔ اور آپ نے بتا دیا کہ پاکبازی کی زندگی کے معنی یہ نہیں کہ انسان ساری عمر پہاڑ کی چوٹی پر گوشہ تنہائی میں دنیا سے دور گذار دے بلکہ تکمیل ذات کے لئے ضروری ہے کہ انسان کشمکش حیات سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو۔ اس زمانہ کے رجحان کے برخلاف آپ نے اپنے متعلقین کو رہبانیت سے اجتناب کی تعلیم دی۔ اور مسلمانوں کو سکھایا کہ وہ خدا سے دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی کے لئے دعا کریں۔ پھر اس دنیا میں بھی آپ نے تنہائی اور تجرد کی زندگی نہیں بسر کی بلکہ ساری عمر اہل وعیال کے ساتھ گذاری۔ اور ہر ایک کو ان کا حق ادا کیا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا کہ آپ اسی دنیاوی زندگی میں منہمک ہو گئے ہوں: بلکہ غار حرا کی خلوت میں غور و فکر بھی آپ نے کیا ہے۔ اور خدا کی یاد میں شب بیداری اور تہجد بھی آپ کا شیوہ رہا ہے۔ انسان دوستی کوٹ کوٹ کر آپ کی ذات میں بھری ہوئی تھی۔ اور خورد و ں اور یتیموں سے آپ کو بے پناہ محبت تھی۔

جب آپ کی قوت و اقتدار انتہائی عروج پر تھے اس وقت بھی آپ کو فقر پر فخر تھا۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ امت کا ہر فرد اپنی جان اور اپنا مال آپ پر نثار کرنے کو عین سعادت سمجھتا تھا۔ لیکن آپ نے کبھی بیت المال سے اپنا پورا حصہ نہیں لیا۔ اور وفات کے بعد کوئی اثاثہ گھر والوں کے لئے نہیں چھوڑا امت میں آپ نے اپنے لئے یا اپنے اہل وعیال کے لئے کوئی خاص مقام مقرر نہیں کیا۔ اور عقیدت مندوں کو خدا کا فرمان یاد دلایا کہ

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الٰھکم الٰہ واحد۔ اور ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔

لوگوں کو اوہام باطل میں مبتلا رکھنے اور مذہب کے نام سے مقتدایان مذہب کا تسلط برقرار رکھنے کی بجائے آپ نے سرے سے مذہبی پیشواؤں کا وجود ہی ختم کر دیا۔ اور خالق ومخلوق کے مابین کوئی پردہ حائل نہیں رکھا۔

آپ نے انہوں کو تعلیم دی کہ دنیاوی معاملات میں عقل کو استعمال کریں۔ اور غور وفکر سے کام لیں۔ پوری قوم کے سیاسی رہنما اور روحانی قبلہ گاہ ہونے کے باوجود آپ نے ہر غزوہ اور جنگ میں ایک معمولی سپاہی کی طرح حصہ لیا۔ اور اپنی جان خطرہ میں ڈالی۔ جمہوریت، مساوات اور اخوت کی ایسی مثال تو دنیا بیسوی صدی کے اس روشن خیال زمانہ میں بھی نہیں پیش کر سکتی۔ جب کہ مملکت کے صدر تو کجا خود فوج کے سپہ سالار بھی مضبوط قلعوں یا زمین دوز پناہ گاہوں میں بیٹھے سپاہیوں کو محاذ جنگ پر روانہ کیا کرتے ہیں۔

آپ کی پیدائش ایک ایسی قوم میں ہوئی جو شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھی۔ ان کی جہالت کا یہ حال تھا کہ جب آپ نے توحید کا علم بلند کیا تو اپنی غلطی اور گمراہی کو محسوس کر کے اس نور ہدایت کو قبول کرنے کی بجائے ان کے کفر والکار میں اور اضافہ ہوا۔ اور انھوں نے شدت کے ساتھ آپ کی مخالفت پر کمر باندھی۔ اور ہر ممکنہ طریق سے آپ کی راہ میں مزاحم ہوتے۔ لیکن اس سے آپ کے عزم مصمم اور یقین محکم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور آپ پوری ہمت اور مستقل مزاجی کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ آپ نے خدا کا پیام انسانوں تک بہ تمام وکمال پہنچا دیا۔ اور اپنے مشن کی تکمیل کر لی۔

تاریخ عالم میں کوئی اور دوسری مثال ایسی نہیں ملتی کہ ایک فرد واحد نے اس قدر بے سروسامانی کے ساتھ ابتدا کر کے نہ صرف ایک قوم بلکہ ایک دنیا کی موجودہ اور آئندہ قسمت میں اس قدر زبردست انقلاب پیدا کیا ہو۔ یہاں تو میں نے شمائل نبوی میں سے صرف ایک دو نکات ہی بیان کئے ہیں۔ ورنہ بے شمار جلدیں ذکر مبارک سے بھری ہوئی ہیں جب خود حضرت ذوالجلال اس ذات پاک کی حمد کرتے ہوں تو ہماری کیا حقیقت ہے کہ اس کی جرأت کریں

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

مقصود اس مختصر تحریر سے یہ ہے کہ مسلمانوں پر واضح کر دیا جائے کہ وہ کس طرح "باعث رسوائی پیغمبر" بن گئے ہیں ان میں کہیں بھی اسوۂ حسنہ کی جھلک نظر نہیں آتی عوام گمراہ ہیں اور خواص ریاکاری میں مبتلا۔ ان کی عبادت کا یہ حال ہے کہ مسجد ومحراب بھی ان کے سجدے قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔

بزمیں چو سجدہ کردم ۔ ز زمیں ندا بر آمد
کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

اس دور میں امت مسلمہ کے ہر فرد کا یہ اہم ترین فریضہ ہے کہ وہ رسول کریمؐ کے اسوہ حسنہ کا قلب ونظر کی پوری گہرائیوں اور وسعتوں کے ساتھ مطالعہ کرے اور پھر اپنی حالت پر غور کرے کہ وہ کہاں تک اس قابل ہے کہ اس ذات قدس صفات کے نام لیواؤں میں شمار کیا جا سکے۔

چوں نہ داری از محمدؐ رنگ و بو
از درود خود میالا نام او

مطبوعات طلوع اسلام
کی
شرائط ایجنسی
شرح کمیشن

معارف القرآن ـــــــــ ۲۵ فی صدی
دیگر مطبوعات ـــــــــ ۳۳ فی صدی

۱۔ قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائے گی۔
۲۔ غیر فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی۔
۳۔ پہلی فرمائش پچاس روپے (بعد وضع کمیشن) سے کم نہیں ہونی چاہیئے۔
۴۔ ہر آرڈر کے ہمراہ کم سے کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے ورنہ تعمیل نہیں ہو سکے گی۔

نوٹ :- کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوع اسلام سے معاملہ طے کریں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱۳ کراچی

سلیم کے نام
پیرویز
قیمت چھ روپے

ہر فرد کی عقل

کا تقاضا اس کے اپنے مفاد کا تحفظ ہے۔ اسی طرح ہر قوم کا تقاضا اس کے اپنے مفاد کا تحفظ ہے۔

نہ فرد کی عقل

کسی دوسرے فرد کا مفاد سوچ سکتی ہے' اور نہ

قوم کی عقل

کسی دوسری قوم کے مفاد کا خیال رکھ سکتی ہے۔ لہذا

فرد یا قوم

کے بس کی بات نہیں کہ وہ نوع انسانی کے مفاد کے لئے کوئی نظام وضع کرے۔ ایسے نظام کا سرچشمہ صرف **وحی** ہی ہوسکتا ہے **وحی کا عطا کردہ نظام کیا ہے** ۔ اسے

✡ نظام ربوبیت ✡ (از۔ پرویز)

میں ملاحظہ کیجئے

قسم اول۔ کاغذ سفید کرنا فلی۔ جلد مضبوط مع گرد پوش چھ روپے۔
قسم دوم۔ کاغذ میکانیکل۔ صرف ڈسٹ کور کے ساتھ چار روپے۔

ابلیس و آدم

سب سے پہلا انسان کس طرح معرض وجود میں آیا؟ آدم اور خلافت آدم کا مفہوم کیا ہے۔ ابلیس کیا ہے اور آویزش ابلیس و آدم کیا؟ وحی کیا ہے اور وحی نے انسان کو کیا عطا کیا؟ ان سوالات کے قرآنی جوابات اس کتاب میں دیکھئے۔

صفحات ۳۷۶ قیمت آٹھ روپے

اقبال اور قرآن

اقبال نے قرآنی انقلاب کی آواز سے فضا کو معمور کیا۔

قرآن کیا کہتا ہے اور اقبال کا پیغام کیا ہے؟

ان کے جوابات مفسر قرآن اور ترجمان اقبال پرویز سے سنئے۔

ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

اعجاز القرآن

از علامہ تمنا عمادی مدظلہ

جس میں مختلف جہات سے قرآن کے اعجاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی چند اقساط ماہوار طلوع اسلام میں آپ ملاحظہ فرماچکے ہیں۔ ناظرین کے مسلسل اصرار پر اب اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

جن حضرات کی رقم ادارہ کے پاس جمع ہے انہیں آرڈر دینے کی ضرورت نہیں ان کی خدمت میں یہ کتاب نومبر کے پہلے ہفتہ میں خود بھیجدی جائیگی۔ البتہ ان میں سے جو حضرات یہ کتاب نہ منگانا چاہیں وہ ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء تک مطلع فرمادیں۔

سائز ۸/۳۰ X ۲۰ ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک۔

تاریخ الامت

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کی تاریخ کی وہ بے مثل کتاب جو تقسیم سے پہلے بیشتر درسگاہوں میں بطور نصاب شامل تھی۔ اب مولف کی اجازت سے طلوع اسلام نے اسے دوبارہ چھاپا ہے۔

قیمت حصہ اول (سیرت رسول اللہ صلعم) دو روپے۔

قیمت حصہ دوم (خلافت راشدہ) دو روپے آٹھ آنے۔

کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ باقی حصے عنقریب شائع ہو جائینگے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۷۔ کراچی۔ ۳

اچھی صحت زندگی خوشگوار رکھتی ہے
حفظِ صحت بڑی حد تک دانتوں کی صفائی پر منحصر ہے
دانتوں کی صفائی کے لیئے ...
مسواک ٹوتھ برش
مُفید ترین رفیق ہے
انگلینڈ میں بنا ہوا
مسواک
MISWAK
یہ زندگی خوشگوار رکھتے ہیں
جاری کردہ۔ دفتر مسواک ۵۵ لکشمی بلڈنگ۔ کراچی پاکستان